خودنوشت سوانح حیات

معصوم یادیں

معصوم باتیں

امینہ عزیز صدیقی

مکتبہ صحاف

افشاں کالونی، راولپنڈی کینٹ

نام کتاب--- معصوم یادیں معصوم باتیں

مصنف--- امینہ عزیز صدیقی

ناشر--- مکتبہ صحاف، راولپنڈی کینٹ، پاکستان

کمپوزنگ---

طبع اول--- 08 جنوری 2021ء

قیمت---

رابطہ : Mans.cliff@gmail.com

انتساب

منصور

کے نام

ابتداء

اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰهِ وَالصَّلَوٰتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَ رَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُه، اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰهِ الصَّالِحِيْنَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُه، وَرَسُوْلُه

یہ خودنوشت سوانح بیگم امینہ عزیز صدیقی نے یکم جولائی 2007ء کو مکمل تحریر کی اور ڈاک میں ایک بہت بڑے پارسل کے ذریعہ مجھے اسی ماہ بھجوایا جبکہ میں ان دنوں بیرون ملک تھا۔ پیکٹ میں مذکورہ سوانح حیات علاوہ انکی لکھی ہوئی بچوں کیلیئے انگریزی کہانیوں کا مسودہ اور ان کے چچا کرنل تنویر حسن بشیر کی ہاتھ سے تحریر "مالیر کرٹلہ تاریخ کے آئینہ میں" موصول ہوا اور ھدایت کی کہ اسے ضرور طبع کرا دینا کیونکہ میرے مرنے کے بعد یہ باتیں بھی دفن ہو جائیں گی اور اسکا انتساب منصور کے نام ہو گا ۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا ، میری یہ نادانی تھی کہ ماں کو غیر فانی سمجھتا رہا ۔ اور میرے نزدیک یہ سوچنا بھی گناہ تھا کہ وہ اس دنیا سے چلی جائیں گی بلکہ اسکا کہیں تصور بھی نہیں تھا اور یہ سوہان روح تھا ۔

شاید میری زندگی کی یہ سب سے تکلیف دہ سوچ تھی ۔ حتی کر جب کسی کی ماں فوت ہو جاتیں تو یہ سن کر ہی میرے جسم سے جان نکل جاتی تھی اللہ تعالی کی اپنی حکمت ہے اور انسان فانی ہے ۔سب نے ایک دن اس دنیا سے رخصت ہونا ہے لیکن ماں سے ہمیشہ کیلئے جدائ انتہائ تکلیف دہ امر تھا۔ جس کا کرب زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔

میں بیرون ملک تھا کہ اچانک انہیں کینسر کی تشخیص ہوئ اور مجھے فون کر کے بتایا کہ میں نے سورۃ یسین اور سورۃ یوسف پڑھ لی ہیں جو انہیں زبانی یاد تھیں ۔ یہ سن کر میں رونے لگا تو مجھے سمجھانے لگیں کہ ماں باپ سدا نہیں رہتے ۔

اس سے پہلے جب ڈاکٹر نے بتایا کہ انہیں کینسر ہے تو سب گھر والوں نے ان سے چھپانے کی کوشش کی لیکن شاید انہیں اسکا اندازہ ہو گیا اور ڈاکٹر سے کہا مجھے کینسر نہیں ہو سکتا ۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ چل کر دکھائیں ، اٹھک بیٹھک کریں ، سانس ، بلڈ پریشر ، شوگر سب نارمل تھے - ڈاکٹر کے مطابق ان کا کینسر آخری سٹیج پر تھا اور اس حالت میں ان کی مظبوط قوت اردادی اور

جذبہ ایمانی نے محسوس ہی نہیں ہونے دیا اورسب کام کاج بغیر کسی تکلیف کے حسب معمول سرانجام دیتی ہیں بہرحال ڈاکٹر نے علاج شروع کیا اور کہا کہ اسکا علاج صرف مخصوص انجیکشن ہیں ۔ پہلا انجیکشن لگتے ہی حالت بگڑنا شروع ہو گئی ۔ لیکن بات چیت کرنا نماز پڑھنا جاری رہا ۔اسپتال میں داخل کروادیا گیا۔

پھر اسی ایک ہفتہ کے اندر اندر ہمیں چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی کے پاس تشریف لے گئیں ۔ اس سانحہ کا اتنا شدید اثر ہوا کہ دو برس تک بات بات پر میرا دل بھر آتا اور آنکھوں میں نمی آ جاتی تھی اور اب بھی جب ماں کا چہرہ یاد آتا ہے تو آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں ۔

آپکی پیدائش مالیرکوٹلہ ریاست میں 12 جنوری1934ء کو ہوئی اور وفات 14 مئی 2008ء کو راولپنڈی میں ہوئی ۔

اپنی چوہتر سالہ زندگی بہت سرگرمی سے بسر کی اور آخری عمر تک اپنے سب کام خود انجام دیتی رہیں ، بینائی بھی بالکل صحیح رہی ۔

جب سے ہم نے ہوش سنبھالی انہیں تہجد گزار دیکھا ، نماز روزے کے علاوہ صبح کو تلاوت کرنا اور پھر پورا اخبار باریک بینی سے پڑھنا ، سیاست میں بھی دلچسپی تھی ، بڑے بڑے عہدوں پر رہیں ، تمام بڑے بڑے سیاستدان گھر پر ملنے آتے ۔

گھر میں ہی ایک ویلفیئر سکول کھول رکھا تھا اس میں گرمی سردی کھلی چھت کے نیچے محلے کے نادار بچوں بچیوں کو تعلیم دینا کم از کم دو عشروں پر محیط تھا سکول کیا تھا ایک فلاحی ادارہ تھا اور کمرشل مقاصد نہ ہونے کے سبب اس میں نہ ڈھنگ کا فرنیچر تھا نہ چھت تھی ۔ لیکن اہل علاقہ کے اعتماد کے سبب جوق در جوق بچوں کے داخلہ آتے تھے ۔

ممبران اسمبلی اور وزراء تک آ کر سکول کیلئے امداد کا اعلان کرتے لیکن نہ تو کبھی ان کا وعدہ وفا ہوا نہ میری والدہ نے کبھی انکے دروازے پر جا کر یاد دہانی کروائی۔ اللہ توکل وقت گزرتا رہا ۔

سوشل ورک میں بہت سرگرم تھیں خاص طور پر لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے بہت جذباتی تھیں، انکے دیگر مسائل حل کرانے کیلئے نہ دن دیکھتیں نہ

رات فوری ساتھ اٹھ کر چل پڑتی تھیں ۔ لڑکیوں کو ساتھ لے جاکر بورڈ کے امتحان دلوانا ،انکے کالجوں میں داخلہ کروانے، پرانے خیالات کے لوگ جو بچیوں کی تعلیم کے خلاف تھے ان کو قائل کرکے بچیوں کو تعلیم دینا ۔انہیں ادب اور آداب کے علاوہ دینی تعلیم اور مسائل سے روشناس کرانا۔انکا تا عمر مشن ہی جہالت اور ضعیف الاعتقادی کے خلاف جہاد رہا ۔کسی کی پرواہ نہیں کرتی تھیں ۔

غرض میری ماں اپنی ذات میں ایک ادارہ تھیں ۔ سب لوگ محبت سے بیگم صاحب پکارتے تھے اور اسی نام سے مشہور تھیں- اہل محلہ بہت عزت کرتے ۔ بیس پچیس سال کے عرصے میں بچے پڑھ کر نکلتے رہے بچیاں مائیں بن گئیں ، اتنے شاگرد کہ انہیں خود بھی یاد نہیں تھا۔اردگرد کے دیہات سے بچے پڑھنے آتے ۔ انکی وفات کے بعد لوگ کہتے کہ آج ہماری بیگم صاحب ہمیشہ کیلیئے چلی گئیں ۔

اپنے نو بچوں اور بچیوں کو ڈگریاں دلوائیں، خود پڑھایا ، اردو، انگریزی ، ریاضی، سائنس،اسلامیات اور تاریخ غرض ہر مضمون پڑھاتی تھیں ۔

"معصوم باتیں معصوم باتیں " میری والدہ کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ لیکن اس سوانح کا احاطہ انہوں نے اپنی زندگی کے پہلے بارہ سالہ بچپن تک محدود رکھا ہے ۔

یہ یادداشتیں پاکستان بننے سے پہلے جب وہ مالیر کوٹلہ میں تھیں اس وقت کی ہیں ۔اور اپنی والدہ سلطان جہاں بیگم اور اپنے بڑے بھائی نیر حسن بشیر اور چھوٹی بہن ثمینہ کے ہمراہ 1948ء میں پاک فوج کے ٹرک میں آئیں اور انہیں انکے چچا کرنل تنویر حسن بشیر دیگر اہل خاندان کے ہمراہ لیکر پاکستان پہنچے ۔

مالیر کوٹلہ کی زندگی کے حالات تو والدہ نے تحریر کردئے ہیں لیکن پاکستان ہجرت کے بعد کے مصائب اور پریشانیوں کا ذرا سا بھی ذکر نہیں کیا ۔

جب مہاجرین راولپنڈی میں آئے تو بعض نے ہندو سکھوں کے چھوڑے ہوئے مکانات ، زمینوں یا جائدادوں پر قبضہ کرلیا۔ میرے والد سرکاری ملازمت میں دہلی میں تعینات تھے اور جیسے ہی پاکستان جانے کیلئے تجاویز

مانگی گئیں توانہوں نے سب سے پہلے اپنی رضامندی دے دی ۔جسکے بعد پاکستان جانے کی اجازت سرکار نے دے دی اور وہ 15جون1947ء کو صرف پہنے ہوئے کپڑوں میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر عازم پاکستان ہوئے اور پاک سر زمین پر آ کر سجدہ شکر ادا کیا ۔

اس وقت راولپنڈی میں ہندو سکھ محلے کے محلے خالی کر کے جارہے تھے۔ لیکن انہیں خودی بہت عزیز تھی، علامہ اقبال کے بہت مدح تھے اور بہت سا کلام زبانی یاد تھا اور دوسرے انکی اپنی نظر میں انہوں نے ھجرت تو کی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو ایسا مہاجر نہیں سمجھتے تھے جو متروکہ مکانوں یا جائداد کا حق دار ہو کیونکہ انکے اپنے آباء و اجداد موجودہ پاکستان اور لاہور کے قدیمی رہنے والے تھے لہذا وہ اسے اپنا حق نہیں سمجھتے تھے کہ کسی خالی مکان پر قبضہ کرلیں ۔ اور اسے ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کا حق سمجھتے تھے

البتہ انہیں سرکاری مکان دے دیا گیا ۔ اور دونوں میاں بیوی نے ساری عمر یہیں بسر کی اور آخری سانس بھی اسی سرکاری مکان میں لیا ۔

میری والدہ اور انکی سب نزدیکی فیملی اور رشتہ داروں کی اکثریت راولپنڈی میں آباد ہوئی ۔ ان کا بہت بڑا خاندان اور برادری تھی جو دوسرے شہروں میں آباد ہوئی۔

ہمارے سرکاری گھر میں اکثر مشرقی پنجاب سے آئی ہوئی مہاجر خواتین کی بیٹھک ہوتی اور انکی آپ بیتیاں اور سنائے ہوئے دردناک قصوں سے خواب میں بھی کرپانیں لہراتے دشمن نظر آتے ۔ جو مظالم ان پر ڈھائے گئے اسکا عشر عشیر بھی کہیں ریکارڈ نہیں ہوا ۔ کسی کا خاوند ، کسی کے ماں باپ یا بہن بھائی مار دیئے گئے، بچے راستہ کی صعوبتوں سے گزر گئے ، عورتیں کرپانوں کے نشان دکھاتیں اور ہم سب بچے دم بخود سنا کرتے ۔ لیکن ہر محفل کے اختتام پر آنسو پونچھتے ہوئے کہا جاتا کہ یا اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمیں اپنی پاک سر زمین پر پناہ دی ۔

گو ہمارے کئی رشتہ دار مشرقی پنجاب میں سرکاری ملازمتیں کر رہے تھے اور وہ فیروزپور ، امرتسر اور دیگر علاقوں سے بمشکل جان بچا کر چھپتے چھپاتے پاک سر

زمین پر پہنچے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب بخیر و عافیت اپنی املاک اور گھر بار چھوڑ کر پاکستان پہونچ گئے

میری والدہ اور انکے ساتھ پاک آرمی کے ٹرک میں جو ہماری رشتہ دار خواتین پاکستان آنے کیلیئے بھارتی بارڈر پر پہنچیں تو ان سب کے پاس جو کچھ تھا رکھوا لیا گیا ۔ اور والدہ کو آخری دم تک اپنی ان چھوٹی چھوٹی چیزوں اور اسکے علاوہ گہنے ، ہار، بندے اور پازیب کو کبھی نہیں بھولیں اور وہ واقعہ انکے دل پر نقش ہو گیا تھا اور کبھی نہ کبھی اسے ضرور یاد کرتیں ۔

جب سب لٹے پٹے پاکستان آئے تو اپنے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کی کوشش میں سر گرداں تھے چونکہ اکثریت پڑھے لکھے افراد پر مشتمل تھی کچھ سول سروس میں تھے تو انہیں سرکاری ملازمتیں مل گئیں کہ پیپلز پارٹی کی حکومت میں بھٹو نے جو 13 سو افسر نکالے ان میں کوئ ڈیڑھ درجن کا تعلق اس فیمیلی سے تھا جنہیں بے قصور بغیر کسی محکمانہ یا عدالتی کاروائ کے بہ یک جنبش قلم بغیر کسی نوٹس کے ملازمت سے فارغ کر دیا۔ مرتے کو مارے شاہ مدار ۔

سونے پہ سہاگا کہ 1977 ءمیں بھٹو دور ہی میں والدصاحب کو اٹھا کر کوئٹہ پوسٹ کر دیا گیا ۔ اس واقعہ کے بعد وہ ایسا بد دل ہوئے کہ بیمار پڑ گئے کیونکہ اتنی بڑی فیمیلی اور سرکاری رہائش کو چھوڑ کرسب کوکس کے سہارے چھوڑکر کوئٹہ جاتے ۔ پھر وہ کبھی ملازمت پر نہیں جاسکے حالانکہ اسی سال بھٹو حکومت ختم ہوگئی اور ٹرانسفر بھی رک گئی ۔البتہ اس عرصے میں رات کو پہلے بلند آوازسے علامہ اقبال کا شکوہ پڑھتے اور پھر کچھ دیر سکوت کے بعد جواب شکوہ پڑھنے لگ جاتے۔ انکی آواز اورترنم آج بھی کانوں میں گونجتا ہے ۔

اسی دوران شدید مالی مشکلات کی وجہ سے مجھے بادل نخواستہ ملک سے باہر جانا پڑا اور وہیں کسی نے بتایا کہ جنرل ضیاء نے حکومت سنبھال لی ہے اور بھٹو کا تختہ الٹ دیا گیا ہے ۔حالانکہ پیپلزپارٹی کے بڑے بڑے عہدیداروں اور وزراء سے والدہ کے تعلقات تھے، والدہ بہت اچھی مقرر تھیں اورانہیں اپنے جلسوں میں تقریریں کرنے کو بلایا کرتے تھے جس کی خبریں قومی روزناموں میں شائع ہوتیں۔ ایک دوتصویریں جو میرے پاس موجود تھیں اس کتاب کے آخر میں لگا دی ہیں جن میں ڈاکٹرغلام حسین سیکریٹری جنرل پیپلزپارٹی کے ساتھ

جلسہ میں اور شیخ رشید احمد موجودہ ہوم منسٹر کی ہمارے گھر میں تصویریں شامل ہیں ۔

مالیر کوٹلہ سے آنے والے تو پاک فوج کی حفاظت اور مالیر کوٹلہ سرکار کی عنایات سے قدرے بہتر طریقہ سے پاکستان پہونچے لیکن جو دیگر علاقوں امر تسر یا فیروز پور وغیرہ سے آئے وہ بہت چھپ چھپا کر اور مشکلوں سے پہنچے ۔سب افراد اپنے بھرے گھر ،مال و اسباب،مویشی چھوڑ کر پہنے ہوئے کپڑوں میں یہاں آئے تھے۔

والدہ کے سینکڑوں شاگرد تھے جو راولپنڈی ،مری ، ہزارہ وغیرہ کے علاقوں سے تھے اور انکی وفات کی خبر سن کر جنازہ پر سینکڑوں لوگ دور دور سے آئے ۔ جنازہ ریلوے سٹیڈیم میں پڑہایا گیا اور ڈھوک حصو راولپنڈی کے قبرستان میں اپنے شوہر عزیز احمد صدیقی کی قبر کے ساتھ دفن ہوئیں وفات سے قبل ہمارے پڑوسی ماما محمد رفیق کو ساتھ لیکر قبرستان گئیں اور اور خالی جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے یہاں دفن کرنا ۔ وہ جگہ میرے والد کے سرہانے کی طرف تھی ،کافی عرصہ وہ جگہ خالی پڑی رہی اور کسی کی

نظر نہیں پڑی۔ ماما رفیق نے ہی اسی جگہ قبر کھودی اور اسی جگہ آسودہ خاک ہوئیں۔

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم　　　　جو چلے تو جاں سے گزر گئے

جیسا کہ انہوں نے اپنی داستان حیات میں تحریر کیا ہے اور درحقیقت وہ کبھی اپنی زندگی کے پہلے بارہ سالوں کو نہیں بھول سکیں انہیں اپنا گھر اور اپنی چیزیں اور بچپن بہت یاد آتا تھا اور وہ کبھی نہ کبھی اس کا تذکرہ ضرور کرتی تھیں ۔

والدہ کے دادا شیخ بشیر حسن بشیر بھی مالیر کوٹلہ کو خیر باد کہ کر پاکستان آئے تو کچھ عرصہ ہمارے ہی گھر راولپنڈی میں قیام کیا۔ والدہ انکے پاکستان آنے کے بعد اپنے حالات پر آزردہ ہوتیں تھیں کہ کہاں ان کے ٹھاٹھ باٹھ اور شاہی زندگی اور یہاں پر ہم بے سروسامانی اور مشکلات سے دوچار تھے ۔یہ شاید 1957 یا 1958ء کا ذکر ہے۔میں تختی لکھتا تو وہ اس پر قلم سے بہت خوبصورت اصلاح کرتے ۔ چونکہ وہ شاعر تھے اس لئے اپنا کلام دینے ایک دو مرتبہ روزنامہ جنگ راولپنڈی کے دفتر گئے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے ،

اس وقت جنگ کا دفتر کشمیر روڈ پر ہوتا تھا - میں اتنا چھوٹا تھا کہ جس میز کے اردگرد ایڈیٹرز بیٹھے ہوئے تھے وہ میز بمشکل میری ناک تک اونچی ہوتی تھی ۔مجھے اتنا یاد ہے وہاں پر صحافی ان سے بہت باتیں کیا کرتے تھے-

پھر وہ اپنے بڑے بیٹے شبیر حسن بشیر کے پاس سکھر چلے گئے تھے اور وہیں فوت ہو کر دفن ہوئے ، اب تو اللہ تعالی کے فضل اور کرم سے سب کے حالات بہت بہتر ہو چکے ہیں اور اکثر لوگ وہ کسمپرسی کے دن بھول چکے ہیں کہ کیسے مہاجرین خالی ہاتھ آئے اور کن کن مشکلات سے دو چار ہوئے ورنہ وہ جدوجہد کی لازوال داستانیں اور زندہ رہنے کیلئے جو پاپڑ بیلے گئے اگر کہیں لکھے جائیں تو سینکڑوں کتابیں لکھی جاسکتی ہیں ۔

والدہ نے اپنے جس جس رشتہ دار کا تذکرہ کیا ہے میں نے کوشش کی کہ ان کی تصاویر اس کتاب میں شامل کردوں۔ اب تو سب اپنے خالق حقیقی کے پاس جا چکے ہیں– اللہ سب کی مغفرت فرمائے آمین۔

میں نے اپنی والدہ کے خاندان کے بارے میں تفصیلات اپنی کتاب " انساب صدیقی" مطبوعہ 1985ء میں تحریر کی تھیں اور مزید تفصیلات اور شجرہ جات اپنی کتاب " یادگار صدیقی" میں تحریر کر دئے ہیں جو کہ زیر طبع ہے۔

اس سوانح کا ایک ایک لفظ والدہ نے خود تحریر کیا ہے اور اس میں بغیر کسی اضافے کے ہوبہو پیش کر دیا ہے۔انتساب بھی ان کی خواہش کے مطابق تحریر کیا ہے۔

میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں والدہ کی خواہش پوری کر سکا۔اب انکی انگریزی میں لکھی بچوں کی کہانیوں کا قرض مجھ پر باقی ہے-اللہ نے ہمت دی تو وہ بھی پیش کر دوں گا ۔ آسانی کیلیئے اس کتاب میں والدہ کا ددھیالی شجرہ شامل کر دیاہے اور جو تصاویر موجود تھیں انکے نیچے بھی نام تحریر کر دئے ہیں۔اسی طرح ان کے ننھیال کے بارے میں مختصر تعارف اسی کے ساتھ درج کر دیاہے۔

نیر حسن بشیر جو میرے ماموں تھے آرمی انٹیلیجنس میں بہت بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے اور بعد ازاں بے نظیر حکومت میں ایڈوائزر بھی رہے، فوت ہو کر اسلام آباد میں دفن ہوئے۔

ثمینہ میری خالہ اور خوش دامن بھی تھیں ان کی شادی محمود الحق صدیقی سے ہوئی اور فوت ہو کر میانی صاحب لاہور میں دفن ہوئیں۔

میرے والد عزیز احمد صدیقی تھے اور انکے خاندانی حالات "انساب صدیقی" اور "یادگار صدیقی" زیر طبع میں تفصیل سے درج کئے ہیں۔

منصور احمد صدیقی

8 جنوری 2021ء

بِسۡمِ ٱللَّهِ ٱلرَّحۡمَٰنِ ٱلرَّحِيمِ

از امینہ عزیز صدیقی

یہ وہ داستان ہے جو شاید میرے مرنے کے بعد پھر کبھی کوئی نہ لکھ پائے گا – یہ میری اپنی گھر کی داستان ہے جہاں میرا بچپن گذرا ۔ ایک سنہری یاد کا زمانہ جسکی یادیں بھلائے نہیں بھولتیں یہ میرے بچپن کی کہانی ہے چند یادیں ۔

جو خواب میں مسلسل آتی ہیں بے چین کئے رکھتی ہیں۔

معصوم یادیں معصوم باتیں ۔

ایک بڑی سے حویلی جس میں جس میں زنانہ و مردانہ الگ حصہ تھے ۔ وہ زمانہ ایسا تھا جب مرد علیحدہ حصوں میں رہتے تھے اور خواتین علیحدہ حصوں میں رہتی تھیں –

اباجی میرے دادا ان کا باہر کی حویلی میں بڑا ڈرائنگ روم تھا۔

جسکے قالین پر پاؤں رکھتے تو معلوم ہوتا کہ ریشم پر چل رہے ہیں ۔

اباجی نواب صاحب کے ساتھ رہتے ہم انکے ڈرائنگ روم میں کھیلتے رہتے
- ڈرائنگ روم کے ساتھ داہنی طرف ان کا بیڈ روم تھا اور بائیں طرف
بڑی سی لائبریری تھی -ڈرائنگ روم کی دیواروں پر سرخ گلاب کے وال
پیپر آویزاں تھے اور بڑے بڑے جھاڑ فانوس چھتوں سے لٹک رہے تھے-

بیچ والے فانوس پر سنہری کناروں والے بڑے بڑے گلاس نما سرکل تھے-
مجھے وہ بہت پیارا لگتا تھا- اس میں بلور کی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں ۔ایک بڑا
صوفہ، ایک بیڈ کاؤچ ، ایک رائٹنگ ٹیبل اور چھ سات گدی لگی

ہوئی کرسیاں تھیں - جبکہ بیڈ روم میں اس زمانے کے مطابق بڑی

سی مسہری بچھی ہوئی تھی- سبز رنگ کا قالین اور ایک بیڈ کاؤچ-

ایک سنہرے ہینڈل والی الماری تھی جس پر تالا لگا رہتا تھا- میری

حسرت رہی کہ کبھی اسے کھول کر دیکھوں- ہر چیز میں گھس جانا میری

زبردست ہابی تھی ۔

ساتھ ہی ڈریسنگ روم تھا جس میں کھونٹیوں پر کپڑے لٹکے ہوئے تھے ۔

براؤن کلر کا قالین تھا ، ایک چھوٹا تخت اور پھر باتھ روم آتا تھا ۔

ڈرائنگ روم سے باہر بڑا سا برآمدہ تھا - دائیں طرف لائن میں میرے دونوں چچاؤں کے کمرے تھے ، ایک کمرہ بطور گیسٹ روم استعمال ہوتا تھا۔ ان کمروں کے آگے بھی برآمدہ تھا۔کمرے بند رہتے

تھے۔

چچاجان علیگڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ اور چھوٹے چچااس وقت نزدیکی کالج میں ایف ایس سی کر رہے تھے ۔میں کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھتی لیکن کچھ نظر نہ آتا۔

دوپہر کو جب سب سو جاتے تو میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ چپکے

سے لائبریری میں چلے جاتے ۔ الف لیلی نام کی کتاب نکالتے جو حجم

میں بہت بڑی تھی اسکو پڑھتے کچھ سمجھ میں نہ آتا دوسرے ڈر لگتا تھا کہ کوئی ملازم آ گیا تو شکایت ہو جائے گی- اور تو کچھ سمجھ آتی تو شیشہ کے گول پیپر ویٹ لیکر کھیلتے- وہ پیپر ویٹ بہت خوبصورت تھے کانچ کے بنے ہوئے اور اس میں درخت پودے نظر آتے-

میز پر ایک بڑا سا قلمدان ہوتا تھا-جس میں باریک ترشے ہوئے قلم اور ہولڈر ہوتے تھے-جس میں رلیف کے نب لگے ہوتے تھے- اب بچے ہولڈر اور نب کو نہیں جانتے وہ بال پین استعمال کرتے ہیں -کسی کسی ہولڈر میں زیڈ کا نب ہوتا تھا جس سے موٹا لکھا جاتا تھا- قلمدان میں سرخ، کالی اور نیلی روشنائی ہوتی- قطار میں دیواروں کے ساتھ کرسیاں ہوتیں، سرخ پھول والا قالین اور کتابوں سے بھری الماریاں، یہ وہ زمانہ تھا جب ہم ٹھیک سے پڑھ بھی نہیں سکتے تھے- کاش اب وہ لائبریری ہو

اور ہم دیکھیں اس میں کون کون سی کتابیں ہوتی تھیں ۔ وہ زمانہ ختم ہو گیا،

کمرے ختم ہونے کے بعد توشہ خانہ آتا اور پھر ملازمین کے کمرے، بڑا ساپھاٹک جو رات کو بند کردیا جاتا تھا ۔ وہاں صحن کے ساتھ ایک کمرہ ہوتا تھا جو کہ لیمپ روم کہلاتا تھا ۔

اس میں دنیا جہاں کے لیمپ اور لالٹین ہوتے تھے ۔ بجلی کی فٹنگ پورے گھر میں تھی مگر بجلی کبھی کبھی آتی تھی۔ سرشام عطو (ملازم) چمنیاں صاف کرکے تیل بھر کرلیمپ روشن کرکے کمروں میں رکھ دیتا ۔زنانہ حویلی کے لیمپ ڈیوڑھی میں رکھ دئے جاتے- اندر کی ملازمہ جگہ جگہ لیمپ رکھ دیتی -

ایک ہال کمرے میں چار چار لیمپ بڑی چمنیوں والے رکھ دئے جاتے-عطو پرانا ملازم تھاجس کے ذمہ صرف اباجی کا کام تھا ۔وہی کپڑے نکالتاجوتے پالش کرتا ،کپڑے استری کرا کے لاتا ، اباجی کا حقہ تازہ کرنا اور انکے باہر کے سب کام اس کے سپرد تھے -

سرشام ماشکی آ کر صحن میں چھڑکاؤ کرتا تھا پھر کرسیاں ترتیب سے رکھ دی جاتیں-ایک آرام کرسی اباجی کیلئے درمیان میں رکھ دی جاتی-مغرب سے پہلے

لوگ ملاقات کیلیۓ آنا شروع ہو جاتے ۔ پتہ نہیں کیا باتیں ہوتی تھیں۔کسی دن شام اباجی نہ ہوتے تو ہم کرسیوں سے کھیلتے ۔

اندر بھی بڑا صحن تھا جسکے چاروں طرف برآمدے اور ہال کمرے تھے۔شام کو اندر بھی چھڑکاؤ کیا جاتا تھا۔ پھر نواری پلنگ پر ہماری دادی صاحبہ کیلیۓ بستر لگا دیا جاتا۔بستر ایک دری ، ایک چوتہی ، اس پر سفید چادر اور

سفید غلاف والے تکیہ رکھ دیۓ جاتے۔ بوا جی ،ہم دادی کو بوا جی کہتے تھے وہ شام ڈھلے باہر آتیں ، بڑی پھوپھی انکے ساتھ ہوتیں ، انکی لکڑی سے بنی صندوقچی جس پر چھوٹا سا تالہ لگا ہوتا وہ پلنگ پر رکھ دی جاتی۔پرس کا رواج نہیں تھا صندوقچی میں روپۓ ہوتے تھے۔ ایک بڑا ساپاندان جو اب دیکھنے کو نہیں ملتا ، میز پر رکھ دیاجاتا ، ساتھ ہی ٹائم پیس رکھ دیا جاتا۔

میری بڑی پھوپھی جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھیں۔انکے تین بیٹے ہوۓ مگر دو وفات پا گئے تھے۔ وہ پورے گھر کو کنٹرول میں رکھتیں۔ہماری دادی بہت کم سخن تھیں۔ میرے بڑے پھوپھا صاحب مجسٹریٹ درجہ اول

تھے جنہوں نے جوانی میں وفات پائی اسی لئے میری بڑی پھوپھی ہمارے

دادا کے گھر رہتی تھیں- ان کا بہت زور اور دبدبہ تھا ملازمائیں ان سے ڈرتی

تھیں-گھر کا تمام حساب کتاب ان کے ذمہ تھا- ان کا پلنگ بھی دادی کے

فریب بچھا دیا جاتا- گھر کا کھانا اور ملازموں کیلیئے کھانا ان سے پوچھ

کر پکایا جاتا تھا- ایک ملازمہ پلیٹ اور مصالحہ لاتی اور پھوپھی صاحبہ مصالحہ نکال

کر دیتیں- ہمارے ہاں چاول روزانہ ہر کھانے کے ساتھ ہوتے۔بڑے تخت پر

دستر خوان بچھا کر سلیقہ سے کھانا لگا دیا جاتا- ملازمین کا کھانا علیحدہ پکتا تھا جس

میں گوشت کی مقدار انکے لئے کم ہوتی تھی،زیادہ تر سبزیاں اور ساگ انکے لئے

پکتا تھا- معلوم نہیں یہ امتیاز کیوں برتا

جاتا تھا- بڑے سے تھال میں رکھ کر روٹیاں اور سالن باہر جاتا -

چچا جان علیگڑھ میں زیر تعلیم تھے اور ہوسٹل میں رہتے تھے-چھوٹے چچا ایف

ایس سی کے بعد فوجی ٹریننگ کیلیئے چلے گئے تھے= بس ہمارے دو چچا اور دو

پھوپھیاں تھیں۔

دونوں پھوپھیاں کتابیں پڑھتی تھیں - مجھے یاد ہے امتیاز علی تاج کے افسانے ، حجاب امتیاز علی کے ناول ، رضیہ بٹ اورایم اسلم کے ناول، عصمت رسالہ ، راشدالخیری کا جوہرنسواں کے علاوہ تہذیب نسواں بھی آتا تھا—اور کئی اس زمانے کے ناول نگار تھے - بس صرف ناموں کی حد تک انہیں دیکھ سکتے تھے— سخت پابندی تھی کہ کوئی بچہ ناول نہیں پڑھے گا ، نہ بڑوں کے رسالوں کو چھوئے گا—

شی اور ریٹرن آف شی کا میرے بڑے پھوپھاجو جواں مرگ تھے انہوں نے ترجمہ کیا تھا—اس کتاب کا نام عذرا اور عذرا کی واپسی تھا - یہ اردو نام دئے گئے تھے، معلوم نہیں اب یہ کتابیں ہیں بھی یا نہیں ۔

ہم تین بہن بھائی تھے -ہم دو بہنیں اور بھائی۔میں مستقل دادا کی حویلی میں رہتی تھی—مجھے اپنا گھر اچھا نہ لگتا ۔ اباجی نے ہمارے والد کی شادی کے فورا بعد حویلی سے متصل علیحدہ گھر انکے لئے بنوا دیا تھا - میں حویلی کے بڑے بڑے کمروں میں گھومتی رہتی، مجھے ہر کمرے کی ہر چیز کا علم تھا۔ الماریوں میں کیا ہے ،

دادی کا بیڈروم کیسا ہے ،پھوپھیوں کے کمروں میں کتنی میزیں کرسیاں اور پلنگ ہیں ، باتھ روم کیسے ہیں ، چچاؤں کے کمروں میں کیا کیا ہے ۔

زنانہ حویلی اس طرح تھی کہ بڑے سارے صحن کے چاروں طرف بڑے بڑے ہال کمرے تھے- ہر ہال کمرے کے دو اطراف بیڈروم، ڈرائنگ روم اور باتھ روم تھے-

نمبر دو ہال کمرہ کھانے کا کمرہ کہلاتا تھا- اس میں لکڑی کا بنا ہوا سمجھئے پورا گھر تھا–میرا خیال ہے کمرہ کی تعمیر کے وقت ہی اسے اندر بنایا گیا ہو گا اور وہ کمرے سے نکل نہیں سکتا تھا- اس میں سوکھا سودا کنستروں میں رکھا جاتا تھا - دالیں چاول، چینی، طرح طرح کے اچاروں کے بڑے بڑے بیام ۔آم کا مربہ جو ہماری خاص پسند تھا ، خاص کر میری ، میں دوپہر کو اچار اور مربہ چوری کرتی بلکہ بھائی کو بھی نہ بتاتی کیونکہ وہ مربہ کا حقدار ہو جاتا ۔ زیادہ تر مربوں کے مرتبان بوا جی کے بیڈروم کی الماری میں ہوتے تھے– جہاں مشکل سے ہی میری پہونچ تھی –

اباجی کے ڈرائنگ روم میں ایک الماری تھی اس میں بھی مرتبانوں میں کچھ میٹھی چیزیں ہوتی تھیں ، وہ تو میں ضرور چوری کر کے کھاتی ۔ اللہ جانے وہ کیا ہوتا تھا- ایک دن بھائی نے میری امی کو شکایت لگا دی کہ یہ اباجی کے مرتبانوں سے کچھ چوری کرکے کھاتی ہے۔میری امی نے بری طرح ڈانٹا کہ وہ دوائیں ہوں گی خبردار دوپہر کو باہر گئی –

منا لال بنیا جو اچار مربہ بنا کرلاتا اور ہر چھ ماہ بعد چھکڑوں میں سامان بھر بھر کر لاتا ۔ جہاں سے میری پھوپھی کا باتھ روم شروع ہوتا وہاں سے گودام شروع ہو جاتا –

گودام میں بڑی بڑی دیگیں رکھی رہتیں ، بڑے بڑے دیگچے ، بوریاں ان دیگچوں میں الٹا دی جاتیں اور سامان نہ جانے کیا ہوتا تھا– میرا دھیان چاروں طرف ہوتا تھا ،میں ٹک کرتو بیٹھتی نہیں تھی۔

دیوالی آتی تو سب سے پہلے منا لال مٹھائی کا تھال سجا کرلاتا، پتہ نہیں وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا ، اباجی سے بہت سارے نوٹ پکڑلیتا یہی بات اسکی مجھے بری

لگتی تھی-سال دو سال بعد اسے رقم دی جاتی تھی۔ ماہوار تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔اسکے کان میں ایک سونے کی بالی ہوتی تھی ، دبلا پتلا پان کھاتا ہوا۔

سارا دن مٹھائی کے تھال آتے رہتے مٹھائی کنستروں میں بھر دی جاتی ۔پھر پتہ نہیں اگلے دن کنستر خالی ہو جاتے،شاید بانٹ دی جاتی ہو گی ۔

اب ہماری پرانی حویلی منا لال کے پوتے کے پاس ہے جس نے اس میں کچھ ردوبدل نہیں کیا۔ چند برس پہلے میرے چھوٹے چچا (کرنل تنویر حسن بشیر) مالیر کوٹلہ گئے تھے وہاں سے حویلی کی تصویریں لائے تھے۔

یہ داستان ایک مسلم ریاست مالیر کوٹلہ کی ہے- میرے دادا ریاست کے پرائم منسٹر تھے (شیخ بشیر جسن بشیر) اس زمانے میں چھوٹی ریاستوں میں کاریں نہیں ہوتی تھیں ، خاص کر چھوٹی ریاستوں میں دو گھوڑوں والی بگھیاں استعمال ہوتی تھیں۔جسکے پیچھے چوبدار کھڑے ہوتے تھے۔

اباجی صبح صبح باغ چلے جاتے تھے ۔ باغ شاید نواب صاحب کے محل کو کہتے تھے- میں بہت صبح اٹھتی تھی، ابھی میرا بھائی اور بہن سو ہی رہے ہوتے تھے

کہ میں اباجی کو ناشتہ کرتے دیکھتی، وہ چھری کانٹا استعمال کرتے تھے ،میری ڈیوٹی تھی کہ اباجی کے برتنوں کو رات کے وقت ٹرے میں سجاکے رکھوں۔ یہ کام بہت چھوٹی عمر میں بڑی پھوپھی نے میرے سپرد کیا تھا۔ چائے دان ،شکر دان ، دودھ دان ، دو چھریاں دو کانٹے ، بڑی چھوٹی پلیٹیں ، ایک پیالہ جس میں اباجی چائے پیتے تھے ۔

ہم سب سبز چائے پیتے تھے جو میری بڑی پھوپھی بڑے اہتمام سے بنایاکرتی تھیں ، اباجی لپٹن چائے پیتے تھے ، اس زمانے میں لپٹن چائے کے بڑے ٹین آتے تھے- اب بھی آتے ہونگے لیکن نظر سے نہیں گزرے،جاتے ہوئے ابا جی مجھے ضرور پیار کرتے بس اتنا ہی لاڈ مجھے یاد ہے ۔

اباجی شاعر تھے ۔ ہمارے یہاں بڑے بڑے مشاعرے ہوتے تھے دہلی، لدھیانہ اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے شعراء آتے تھے۔جس روز مشاعرہ ہونا ہوتا ۔ میری اور میرے بھائی کی عید ہوتی،ہم تیاریاں دیکھتے اور خوش ہوتے۔ بار بار چھڑکاؤ ہوتا پھر دریاں بچھتیں اور پھر قالین بچھائے جاتے، گاؤ تکیہ لگا دئے

جاتے خاصدان جگہ جگہ رکھ دئے جاتے ، کونوں میں چمکتے ہوئے پیک دان رکھے جاتے ، شعراء آنے شروع ہو جاتے ۔

بس مجھے عنصرلدھیانوی اورساحر لدھیانوی اچھی طرح یاد ہیں ، سرعبدالقادر بھی ایک مرتبہ آئے جنہوں نے اباجی کے دیوان کا دیباچہ لکھا تھا۔مگر دیوان چھپ نہ سکا، عنصرلدھیانوی نابینا تھے وہ جب غزل پڑھتے تو واہ واہ کا شوراٹھتا ،لوگ مارے جوش کے رانوں پر ہاتھ مار مارکر داد دیتے، یہ سب کچھ بچوں کیلئے ایک تماشہ ہوتا۔ میں کاغذ پنسل لیکر بیٹھتی جس شعر پر داد پڑتی ،مکرر مکرر کا شور مچتا وہ شعر کئی دفعہ پڑھا جاتا اور جسے میں آسانی سے لکھ لیتی ۔ بہت کم عمر میں مجھے اچھے برے شعر کی پہچان ہو گئی تھی ، بعد میں کاغذ کہیں گم ہو جاتا۔

جیسے پہلے ذکر کیا ہے اباجی کے ڈرائنگ روم میں بڑے بڑے جھاڑ فانوس تھے ، درمیان والا بڑا جھاڑ فانوس جس میں مخرمطی شکل کے بلور لٹکے ہوئے تھے وہ بہت اچھا لگتا تھا۔ میرا بڑا دل چاہتا کہ سنہری زنجیروں میں لٹکے ہوئے یہ سرخ بلور توڑ دوں ۔ایک دوپہر میں نے ہمت کرلی اور میز گھسیٹ کر

فانوس کے نیچے لے آئی بھائی باہر پہرہ دے رہا تھا ، ہاتھ پہونچ نہیں سکتا تھا ، میں نے اباجی کی چھڑی اٹھا کر زور سے ماری ، زور دار آواز آئی ، میرا دم نکل گیا ، لیکن سنہری زنجیر سے ایک بلور ٹوٹ کر نیچے گرا میں نے جلدی سے اٹھا لیا ، بھائی کہتا تھا کہ اس میں سات رنگ نظر آتے ہیں ، خیر میز خدا خدا کر کے اپنے ٹھکانے پر پہنچائی ۔

بلور لیکر سورج کی طرف دیکھا تو واقعی کئی رنگ نظر آئے، بھائی نے میری محنت کی کمائی فورا مجھ سے چھین لی اور کہیں غائب کر دی پھر اسکی شکل نظر نہ آئی ۔

ہم تین بہن بھائی تھے ، والد ہم کم عمر ہی تھے کہ وفات پا گئے ، میری والدہ انیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئیں تھیں ۔میری سب سے چھوٹی بہن والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئیں ۔

ہمارے دادا کیلیئے دو سانحہ ایسے تھے جو اللہ کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے ۔ جوان داماد کی وفات اور پھر جوان بیٹے کی ناگہانی وفات جو تین بچے ان پر چھوڑ کر چلے گئے ۔

سب صبر و رضا کے پیکر تھے کسی کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا حتیٰ کہ ہمیں یہی معلوم تھا اباجی (دادا) ہمارے والد ہیں ۔

ہم تینوں بہن بھائیوں کیلیئے الگ الگ ملازم رکھ دئے گئے تھے۔ ہماری ماں میں صدمہ سے اتنی سکت نہ تھی کہ ہمیں سنبھال سکتیں، مجھے یاد ہے میں مستقل اپنی آیا کی گود میں رہتی وہی مجھے کھانا کھلاتی ،کپڑے بدلتی، کنگھی کرتی ۔ وہ گاؤں کبھی کبھی جاتی تو مجھے بہت رونا آتا ۔ وہ دو دن کے بعد ہی واپس آ کر مجھے گلے لگا لیتی ، میرے لئے گاؤں سے میٹھی روٹی بنا کر لاتی اور رات کو لوری دے کر سلاتی۔

بھائی کے ملازم کا نام چھانگا تھا ، اسکی چھ انگلیاں تھیں ، وہ بھائی کو گود میں رکھتا ، اسکی خدمت کرتا ۔ چھوٹی بہن کے ملازم کا نام نیامت تھا جو شاید نعمت سے بگڑ گیا تھا۔

میری اپنی دلچسپیاں تھیں لیکن میری بہن کو قطعا میری سرگرمیوں سے کوئی سروکار نہیں تھا ، وہ ماں کے ساتھ رہتی یا نیامت علی کی گود میں سوار رہتی۔

میری سرگرمیاں بڑھتی جا رہی تھیں-جب بھی گھر کی کوئی ملازمہ جوتا پہن کر آتی تو میں فورا اسکا جوتا چھپا دیتی ، میری بڑی پھوپھی جو اکثر میری شرارتوں کی پردہ پوشی کرتی تھیں ، سارا دن چپکے چپکے پوچھتی رہتیں، شام کو کہیں جاکر بتاتی ۔ جوتے چھپانے کی جگہ میں بدلتی رہتی تھی۔یہ تقریبا روزانہ کا دستور تھا ۔

اگلے دن میں خوب اسکے بچوں کو مارتی وہ روتے تو میری پھوپھی کو پتہ چل جاتا کہ اسکے پیچھے کس کا ہاتھ ہے ۔ وہ ان بچوں کو کچھ دے دلا کر چپ کرا دیتیں ۔ وہ کہا کرتیں جب بھی باہر سے رونے کی آواز آتی ہے میرا دل بیٹھ جاتا ہے ۔

ہمارا گھراور اسکا پچھلا حصہ اکثر سنسان رہتا ۔ کیونکہ ہمارے گھر کے ساتھ اصطبل بنے ہوئے تھے ۔ ہم نے اپنی ہوش میں گھوڑے نہیں دیکھے ، گاڑیاں ضرور پڑی ہوئی تھیں جن پر ہم کھیلتے تھے ۔

جب اصطبل ختم ہو جاتے تو کوٹھی کی گھڑکیاں شروع ہوجاتیں معلوم نہیں یہ کوٹھی کس مقصد کیلئے بنائ گئ تھی۔ آگے جا کر کوٹھی کا گیٹ آتا ۔ بڑی حویلی کا پچھواڑہ بھی اسی طرف تھا ۔

اسکے بعد نوکروں کے کوارٹر اور پھر بڑ اپھاٹک ، یہ بڑے بڑے پھاٹک حویلی کی دونوں اطراف میں تھے ۔ رات کو پھاٹک بند کر دئے جاتے،ایک چھوٹا دروازہ کھلا رہتا جہاں ملازم بیٹھ کر حقہ پیتے رہتے۔

شب رات آتی تو صبح صبح بلکہ منہ اندھیرے حلوائ بڑے بڑے کڑاہے اور برتن لیکر آ جاتا ۔ بہت بڑی کڑاہی میں حلوہ پکتا ۔حلوہ اتنا زیادہ ہوتا کہ اگر آجکل کے لوگ دیکھیں تو پاگل ہی ہو جائیں ۔ پوریاں بھی حلوائ تلتا ،ہم وہاں کھڑے ہو کر دیکھتے رہتے۔پھر حلوہ تمام برادری اور غریب لوگوں میں بانٹ دیا جاتا ۔

ہمیں عید اور شبرات پر صبح صبح جگا دیا جاتا کیونکہ اباجی کو باغ جانا ہوتا تھا۔وہ ہمیں پیار کرتے اور چلے جاتے وہ زیادہ گود میں نہیں بٹھاتے تھے۔

میرے بڑے بھائی کی آمین ہوئی جس پر بہت بڑا فنکشن ہوا۔ بہت لوگ آئے- اباجی نے بھائی کی آمین کی مناسبت سے ایک نظم لکھی۔ نظم کیا تھی اپنے جوان بیٹے کا نوحہ تھا۔

جس نے سب کو رلا دیا۔ ایسی خوشیوں پر گھر کی پوری فضا سوگوار ہو جاتی چپکے چپکے آنسو بہا لئے جاتے ۔ یہ سب میں بھی دیکھتی لیکن آنسو ضبط کر لیتی۔

اب سکول میں داخلہ کا وقت آگیا تھا ، بھائی جو تھی جماعت میں داخل کرایا گیا ۔ایک ملازم بستہ اٹھا کر ساتھ جاتا–میں تیسری کلاس میں اور چھوٹی بہن دوسری کلاس میں داخل ہوئی ۔

گھر پر دو ماسٹر آتے تھے ۔ ایک بی بی قرآن پاک پڑھانے آتی تھیں۔ وہ قرآن تو پڑھاتی نہیں تھیں سوئی رہتی تھیں ہم ورق الٹاتے رہتے، پھر کچھ دیر بعد زور سے کہتیں بی بی پڑھ لیا اور وہ اپنا برقعہ اٹھاتیں اور چل پڑتیں۔ انہیں دو روپیہ ماہوار دئے جاتے تھے ۔

ایک مرتبہ میری بڑی پھوپھی نے کہا آکر قرآن سناؤ، قرآن پڑھا ہوتا تو سناتے ۔ انکو بہت صدمہ ہوا ، ہمیں بہت ڈانٹ پڑی حتی کہ بی بی کا داخلہ بند کرادیا گیا اور دوسری بی بی کور کھا گیا ، وہ محنت سے پڑھاتیں-اس زمانے میں جب تک قرآن ختم نہ ہو جاتا بچے سکول میں داخل نہیں کرائے جاتے تھے۔ خواہ کتنی ہی عمر کیوں نہ ہو جائے۔

عبداللہ جو ایک غلام تھا اسے ہمارے پڑدادا مکہ مکرمہ سے خرید کر لائے تھے ۔ تھے تو تین ، دو عورتیں اور ایک مرد، عورتیں یا کنیزیں انہوں نے اپنی بیٹیوں کو دے دیں ۔

جبکہ عبداللہ اباجی کے حصہ میں آیا۔ یہ بہت تیز دماغ تھا اور غصہ اسکے ماتھے پر ہوتا تھا ۔ جہاں مجھے دیکھتا ڈانٹ کر کہتا اندر چلو۔ وہ ہمیں سکول چھوڑنے جاتا-

اسکول ایک بہت بڑے نوابی محل میں تھا ۔ ہمیں بازوں کے حصار میں لے لیتا۔ سکول نزدیک تھا۔ سکول کے بڑے پھاٹک تک اپنے ہاتھ نیچے نہ کرتا۔ اسی طرح ہمیں واپسی پر لاتا-چھٹی سے آدھ گھنٹہ پہلے آکر پھاٹک پر کھڑا ہو جاتا ۔

ہمیں کبھی کھیلنا نصیب نہ ہوتا ۔ پھاٹک کھلتے ہی ہمیں ڈھونڈنا شروع کر دیتا ۔ پھر اسی طرح اسکے بازوؤں کے حصار میں گھر تک آتے۔

شامت اعمال ایک روز چلتے چلتے میں نے سڑک کنارے پڑے ہوئے ایک بستہ کو ٹھوکر مار دی ، بستہ نالی میں گر گیا، خیر ہو گئی اور عبداللہ ایک لفظ نہ بولا۔شام کو ملازمہ آگئی کہ بڑی بی بی صاحب نے امینہ بی بی کو بلایا ہے میرے دل میں چور تھا میں ڈر گئی ۔

ہمت کر کے پہونچی بواء جی سخت غصہ میں تھیں- انہوں نے سخت الفاظ میں وارننگ دی کہ اگر ایسا کچھ آئندہ ہوا تو پڑھائی ختم۔اسکول بند۔تمہاری جرائت کیسے ہوئی کہ کسی لڑکے کے بستہ کو ٹھوکر لگائی۔کیوں لگائی کیا مقصد تھا ۔پانچویں کلاس کی بچی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔اور مجھے کیا پتہ تھا کہ بستہ لڑکے کا ہے یا لڑکی کا ۔عبداللہ نے نمک مرچ لگا کر بواء جی کو بتایا۔

ایک کنیز کا نام سدھیا تھا جو چھوٹی بہن کے حصہ میں آئی تھی -

ڈیوڑھی سے اندر کوئی ملازم زنانہ حویلی میں نہیں آسکتا تھا- ان دنوں رانی آئی ہوئی تھی اسکو بتا کر اندر بھیجا گیااور کہانی بواء جی تک پہنچائی گئی- خیر بعد میں رانی نے بہت پیار کیا لیکن میری امی نے قطعا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

انہیں تو صرف جاء نماز عزیز تھی یا بھائی ، اسکو روز مالش کر کے نہلایا جاتا ۔اسکے لئے لدھیانہ سے چیزیں آتی تھیں،کوڈلیور آئل مجھے بہت اچھا لگتا تھا اسے چوری چھپے کھاتی ۔اسکے کپڑے بھی باہر سے آتے اوراسے کبھی کوئی کچھ نہ کہتا- ساری پھٹکار میرے لئے تھی- بھائی ہر گڑیا توڑ کر بیری پر ٹانگ دیتا میں روتی تو میری نقل اتارتا ۔

ہماری نانی صاحبہ جو امی کی بیوگی کے بعد اکیلے پن کو دور کرنے کی وجہ سے ہمارے گھر آگئی تھیں ان کا تو وہ آنکھ کا تارا تھا۔صریحا غلطی اسکی ہوتی تو ڈانٹ مجھے پڑتی۔ہر اچھی چیز اسکے لئے ہوتی اور ہم دو بہنیں تواسکی غلام تھیں- یا شاید ہمارا خیال ہو ۔

میری دو خالائیں اور دو ماموں تھے -چھوٹے ماموں (شاہداحمد) گورنمنٹ کالج میں پڑھتے تھے اورہوسٹل میں رہتے تھے-چھٹیوں پر آتے تھے-چھوٹی خالہ

(فرزانہ) میری بہت بڑی دشمن تھیں اور بھائی کی دوست تھیں مستقل اسے پیار کرتیں مجھے جلاتیں ۔میری چھوٹی بہن کو شاید ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا وہ نہ میرا ساتھ دیتی نہ بھائی

کا۔

میرا دل چاہتا بھائی کو پکڑ کر خوب ماروں سارے اگلے پچھلے بدلے لے لوں مگر ہمت نہ ہوتی ۔ میں ایسا کرتی بھی تو واجب القتل قرار پاتی۔مجھے اپنی حیثیت کا اچھی طرح علم تھا۔

یہ میرے اس وقت کے خیالات ہیں، اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ بھائی ہی تو میری ماں کا واحد سہارا تھا۔میری امی بہت خوبصورت تھیں انکے بہت رشتہ آئے لیکن انہوں نے ہاں نہ کی ۔ میرے دادا ،نانا ، چچا اور ماموں سب انکی بے حد عزت اور احترام کرتے تھے۔

وہ کہتیں کہ اگر میں شادی کرلوں گی تو نیر مجھ سے چھوٹ جائے گا ۔

ویسے بھی ہمارے گھرانے میں تہذیب و تمیز پر بہت زور دیا جاتا تھا۔لڑکیوں کا زور سے بولنا معیوب تھا۔ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنا یا سر سے دوپٹہ اتارنا بہت برا سمجھا جاتا تھا ۔ اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ اور کھانے پینے کے آداب سمجھائے جاتے تھے ۔نصیحتوں کی بھرمار رہتی تھی۔کسی نوکر سے بد تمیزی

کرنا دور کی بات ہے چاچا ، ماما ،ماسی کے الفاظ بولے جاتے تھے

مشرقی پنجاب کی ریاست ہونے کی وجہ سے پنجابی بہت اثر انداز ہوگئ تھی۔

نماز پر بہت زور دیا جاتا ۔ میری ننہیال اور ددھیال میں نماز کی بے انتہاء پابندی کی جاتی تھی ۔

آموں کا موسم ہوتا تو اباجی درخت خرید لیتے ۔آم اتر کر آتے رہتے،پال دبا دی جاتی ، ہر صبح میرے دادا اور دادی اس کمرے میں جاتے اورملازمہ پکے آم چن چن کرٹوکری میں ڈالتی جاتی۔ میں تو ساتھ ہوتی تھی۔ میں ہر جگہ ہوتی تھی ۔

اس زمانے میں فریج ، ڈیپ فریزر وغیرہ تو ہوتے نہیں تھے صبح صبح

برف کی سلیں آجاتیں جو بوریوں میں لپیٹ کر رکھدی جاتیں ، برف توڑ توڑکر استعمال ہوتا تھا-بالٹیوں میں آم اور برف ڈالے جاتے تھے ۔

خربوزے بیچنے والی عورتیں علی الصبح ٹوکرے لیکر آ جاتیں پھر خربوزوں کا ڈھیر لگ جاتا- اچھے خربوزے چن لئے جاتے باقی واپس کر دئے جاتے۔ ٹھنڈے پانی کیلئے تھرموس استعمال ہوتے تھے۔ مگر وہ بڑے لوگوں کیلئے ہوتا تھا ۔ہم کورے گھڑوں سے پانی پیتے تھے جس میں مٹی کی خوشبو رچی ہوتی تھی۔ شام کو گھڑونچیوں پر گھڑے رکھ دئے جاتے۔ ان میں ماشکی پانی ڈالتا ۔ان پر چمکتے ہوئے کٹورے الٹا کر رکھ دئے جاتے۔ ان کٹوروں میں شفاف پانی بہت ہی بھلا لگتا ۔ گلاسوں کا اتنا رواج نہیں تھا صرف مہمانوں کیلئے گلاس نکالے جاتے- گھڑوں پر کبھی کبھی خوشبو کیلئے موتیئے کے ہار ڈال دئے جاتے ۔

ہمیں یاد نہیں کہیں جاتے ہوں سب لوگ ادھر ہی ہمارے گھر آجاتے تھے – اباجی کی ایک بہن جنہیں ہم ماں جی کہتے تھے کسی روز صبح صبح ڈولی میں آتی تھیں ۔ کہار ڈولی اٹھا کر صحن تک لاتے پھر گھر کی نوکرانیاں وہ ڈنڈے پکڑ لیتیں اور ڈولی کا پردہ اٹھا دیا جاتا ۔ ماں جی باہر آجاتیں- انکی حویلی اور ہماری

حویلی میں صرف ایک سڑک کا فاصلہ تھا- میرا ڈولی میں بیٹھ کر جھولے کھانے کو بہت دل چاہتا-

ماں جی ہم تینوں بہن بھائیوں کو بہت پیار کرتیں- ایک دفعہ بواء جی کہیں گئی تھیں مجھے اتنا یاد ہے کہ نوکرانیاں چادریں پکڑ کر کھڑی تھیں اور وہ درمیان سے نکل کر سواری میں بیٹھی تھیں۔ بگھی پر بھی پردے لگے ہوئے تھے- یہ یاد نہیں پھر کیا ہوا ، بچپن تھا تجسس کا مادہ بہت تھا۔ مگر کبھی کبھی فیل ہو جاتا-

تعلیم کا تربیت کے ساتھ بہت چرچا تھا۔ صبح اخبار آجاتے ، پرتاپ اور ملاپ دو اخباروں کے نام مجھے یاد ہیں، کیونکہ سکول سے آنے

کے بعد بواء جی کو اخبار پڑھ کر سناتی تھی- انگریزی اخبار باہر آتے تھے۔

چچاجان (شبیر حسن بشیر) نے آئی سی ایس کر لیا تھا اس روز گھر میں بہت خوشی تھی ہر کوئی مبارکباد دے رہا تھا- چچاجان ریلوے آفیسر بن کر ملتان چلے گئے- میرے چھوٹے ماموں (شاہد احمد) بھی آئی سی ایس تھے وہ آڈٹ کے محکمہ میں

چلے گئے شاید ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل یا کچھ اور بنے یاد نہیں پڑتا وہ میرٹھ میں تعینات ہو گئے جو یوپی کا شہر تھا ۔

میرے نانا (مولوی انیس احمد) دیوبند کے فارغ التحصیل تھے اور بہت عالم فاضل تھے۔ہماری نانی صاحبہ (خدیجتہ الکبری) کی اتنی تعلیم نہیں تھی صرف اردو لکھ پڑھ سکتی تھیں۔پاکستان بننے کے بعد ہمارے نانا حیدرآباد سندھ میں حیدر آباد کالج کے پرنسپل رہے۔

مجھے یاد آتا ہے کہ ہمارے نانااور نانی میں چقپلش سی رہتی تھی۔ وجہ تو معلوم نہیں بچپن میں کچھ سمجھ میں آتا تھا - ہمارے نانا کئی کئی مہینوں بعد آتے ، سنا ہے وہ بمبئی کلکتہ وغیرہ میں درس و تدریس کا کام کرتے تھے۔جب وہ آتے بہت سے روپۓ میری والدہ کو دیتے کیونکہ نانی محترمہ ان سے پیسے نہیں پکڑتی تھیں۔

ہماری ننہیال کے لوگ بہت سادہ طبیعت کے تھے ، سادگی سے رہتے تھے ، صرف ایک ملازمہ ہوتی تھی جو کھانا پکاتی تھی،اور ایک لڑکی صفائی کیلئے رکھی ہوتی تھی ۔ میری دودھیال والوں کی طرح نوکروں کی فوج ظفر موج نہیں

تھی ۔ میری والدہ اکثر کھانا نانی کے ساتھ کھاتیں ۔ہمارا کھانا ملازم لیکر آجاتا ، دل چاہتا تو کھا لیتے ورنہ نہ کھاتے۔دودھ پی لیتے۔لیکن کھانا ضرور آتا ، ہمارا کھانا سکول پہنچتا ۔ہم صرف دو بہنیں تھیں جن کا کھانا آتا تھا یا ایک ڈپٹی صاحب کی بیٹیوں کا کھانا آتا تھا ۔ہم بہت منع کرتے کھانا نہ بھیجا کریں لڑکیاں مذاق بناتی تھیں انکا کھانا تو نہیں

آتا تھا۔ وہ سکول کی مائ سے چنے وغیرہ لیکر کھا لیتی تھیں۔

ہمیں پیسے نہیں ملتے تھے ، ہم پیسہ خرچ کرنا بھی نہیں جانتے تھے۔میں سکول میں شرارتیں کرتی کبھی سزا مل جاتی کبھی استانیاں درگذر کردیتیں ۔میں پڑھائ میں تیز تھی ہمیشہ فرسٹ آتی تھی ۔ ایک دفعہ جو سبق پڑھ لیتی ہمیشہ کیلئے یاد ہوجاتا ۔کسی روز میں نہ جاتی تو دیواروں پر وال چاکنگ ہوتی کہ آج امینہ نہیں آئی خدا کا شکر ہے کلاس میں امن وسکون ہے۔میں جاکر مٹاتی میرے ڈر سے کوئ نہ بولتا کہ کس نے لکھا ہے۔

میرے ڈیسک کو کوئ ہاتھ نہ لگاسکتا تھا ۔میں سب سے آگے بیٹھتی سب سے پہلے پرچہ حل کرتی۔ پرچہ حل کرنے کے بعد کاغذ کا پٹاخہ بناتی اورجب زور

سے پٹاخے کی آواز آتی تو لڑکیاں چونک جاتیں ۔ مجھے بطور سزا ڈیسک پر کھڑا کر دیا جاتا یا کلاس سے نکال دیا جاتا ۔ مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا ۔ میں باہر جا کر کھیلنا شروع کر دیتی تا آنکہ عبداللہ لینے کیلئے آ جاتا۔

بڑی حویلیوں کی کچھ روایات ہوتی ہیں ۔جہاں گھر میں کپڑا دھونا یا استری کرنا بھی مشکل ہوتا ہے ۔ صبح دھوبن آجاتی ، رومال جرابیں تک گن کر لے جاتی اور اگلے روز دھو کر استری کر کے لے آتی ۔

نائنیں آتی تھیں جو گرم پانی کر کے غسلخانوں میں رکھتیں پھر سر مل کر صاف کرتیں، بال خشک کرتیں، تیل لگاتیں کنگھی کرتیں ۔ہم نے پاکستان آکر بال دھونا سیکھے ۔ہر ہفتہ بالوں کو تیل لگاتیں۔ ایک نائن کی مجھے یاد ہے جو صرف ہم دونوں بہنوں کے بال دھوتی، ہمارے بال بڑے تھے، لکڑی

کی کنگھی سے بال بنائے جاتے، پلاسٹک کے کنگھے کنگھیاں استعمال نہیں ہوتی تھیں،شاید اسی لئے بال لمبے تھے ، پٹیالہ سے ایک بوٹی کاملی منگوائی جاتی تھی اور سرسوں کھل سے سر دھلتا تھا ۔ کھل بھگو کر اسے کپڑے سے چھانا جاتا تھا پھر اس

دودھ سے سر دھویا جاتا تھا۔ یہ شیمپو تو آجکل کی ایجاد ہیں جو بالوں کو خراب کرتے ہیں-اس عمر میں بھی ہمارے بال کافی لمبے ہیں۔

نائنیں، مراثنیں شادیوں پر جو لینا ہوتا تھا لے لیتی تھیں-

1945ء میں چچا جان کی شادی ہوئ ایسی خوشی نہ کبھی نصیب ہوئ نہ ہو گی ۔دو مہینہ پہلے سے مراثنیں ڈھولکی بجانے لگی تھیں ۔گانے گاتی تھیں، سردیوں کے دن تھے رات گئے تک کمروں میں گانا بجانا ہوتا تھا۔ گھر کی لڑکیوں کا گانا اورڈھولکی بجانا سخت معیوب تھا ۔حتیٰ کہ کوئ لڑکی گانا بھی نہیں گا سکتی تھی، ڈانس تو دور کی بات ہے ۔

میرا دل اپنے گھر میں نہیں لگتا تھا شاید میں بہت حساس تھی، تمام دن حویلی کے کمروں میں گھومتی رہتی ۔ باہر چلی جاتی ،مگر عبداللہ فوری اندر بھیج دیتا ۔ میں ہر صورت دیکھنا چاہتی تھی کہ توشہ خانہ میں کیاہے، جسکو عطو فورا تالہ لگا دیتا ۔

ایک دن وہ توشہ خانہ کھلا چھوڑ کر کسی کام سے اباجی کے پاس گیا میں چھلانگ لگا کر اندر پہونچی ۔ بے تحاشہ کپڑے الماریوں میں ٹنگے ہوئے تھے، کالروں کے رول تھے،ٹائیاں تھیں، جوتوں کی قطاریں تھیں،اور بے شمار تصویریں فریم کی ہوئ اوپر نیچے رکھی تھیں،توشہ خانہ کیا تھا ایک عجائب گھر تھا ۔

سنا ہے یہ تصویریں برآمدوں میں لگی ہوئ تھیں ،شاید وہ سینریاں تھیں جو باہر سے منگوائ گئ تھیں ۔میرے والد (منور حسن بشیر) کے فوت ہونے کے بعد یہ سب اتار لی گئ تھیں۔پھر کبھی نہ لگیں۔ پلک جھپکتے عطو سر پر آگیا ، زور سے بولا چلو یہاں سے اندر چلو باہر مت آیا کرو ۔

شاید میں اب بڑی ہو رہی تھی۔بھائ بھی کسی نہ کسی کارستانی میں لگا رہتا تھا۔ میری بڑی پھوپھی کا ٹائم پیس اچانک غائب ہوگیا،تفتیش شروع ہوگئ ، گھر کی خادماؤں نے قسمیں کھالیں، دو تین ماہ بعد میری خالہ سٹور کی صفائ کروانے لگیں تو ٹائم پیس جو ٹکڑے ٹکڑے تھا ، ایک رومال میں بندھا ہوا ملا ، پہلے تو میرا نام آیا ، مگر میری خالہ بہت اچھی تھیں،انہوں نے کہا یہ امینہ کا کام نہیں لگتا ، یہ نیر کی کارستانی ہے، کیونکہ پیچ کس بھی ساتھ تھا ، اس نے کسی

وقت میں میرے سے چھپ کر یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔ کبھی کبھی وہ غائب ہو جایا کرتا تھا۔میں اسے بالکل نہیں ڈھونڈتی تھی ، مجھے آزادی نصیب ہو جاتی ، میں تو چاہتی ہی نہیں تھی وہ میرے ساتھ رہے ۔مگر وہ مستقل میرے ہر کام میں مداخلت کرتا تھا ، شکایتیں کرتا تھا، کبھی کبھی امی مجھے مار دیتیں تھیں اور چھوٹی خالہ تو ہر وقت مارنے کو تیار رہتی تھیں

میرے سوائے بڑی پھوپھی کے کوئی ہمدرد نہ تھا ،وہ مجھے پیار کرتیں، رات کو کبھی کبھی اپنے پاس سلا لیتیں ۔

میں شادی کا لکھ رہی تھی لیکن یادیں اُمڈی چلی آ رہی ہیں ، کیا کیا لکھوں ، چچا جان کی شادی کیا تھی ایک عجیب وغریب ہنگامہ تھا ۔باہر شامیانہ لگ گئے تھے ، ہندوؤں اور مسلمانوں کا کھانا الگ الگ پکتا ۔سب ایک تھے کوئی کسی کا دشمن نہیں تھا ۔ہندو مسلمان سب کی خوشیاں اور غم سانجھے تھے ۔ دیا کشن وہاں کے بڑے ڈاکٹر تھے لیکن ہر بلاوے پر آجاتے ۔

مالیر کوٹلہ مسلم ریاست تھی مگر گائے کا ذبیحہ منع تھا ، گائے ذبح نہیں ہوتی تھی کہ ہندوؤں کی دل آزادی نہ ہو ۔ نواب احمد علی خان بہت سمجھدار تھے

وہ ہندوؤں اور سکھوں کی اتنی ہی خبر گیری کرتے جتنی مسلمانوں کی ۔ وہ امرتسر سکھوں کے متبرک مقامات پر جاتے- یہی وجہ ہے پاکستان بنتے ہوئے ، ہر ریاست میں خون خرابا ہوا مگر مالیر کوٹلہ امن کا گہوارہ بنا رہا ۔ یہاں کوئی ہندو مسلم فساد نہیں ہوا ۔ خبریں آتی تھیں کہ دوراہے کی نہر لاشوں سے بھر گئی وغیرہ وغیرہ ۔

اب شادی بالکل نزدیک آ گئی تھی ۔ گانے بجانے میں شدت پیدا ہو رہی تھی ۔ رات کو بڑے بڑے دیگچوں میں چائے بنتی جو سب کو پلائی جاتی شادی سے کچھ دن پہلے نواب صاحب کے ہاں سے تحفہ آئے ۔ کنیزیں تھال اٹھائے آئیں ۔دو تھال مالیر کوٹلہ کے روپؤں سے بھرے ہوئے تھے یہ روپیہ چاندی کی گول سی ڈلی کی طرح ہوتا تھا ۔انہوں نے تھال رکھے پتہ نہیں اور تھالوں میں کیا کیا تھا- وہ اندر رکھوا دئے گئے ۔میں کنیزوں کے کپڑوں میں گم ہو گئی تھی ، وہ تھال چھوڑ کر چلی گئیں۔

پھر کچھ یاد نہیں پڑتا چچا جان کی بارات کب روانہ ہوئی، کس طرح گئی،اور کون کون گیا ، میں سوگئی ہو نگی ، یا بہت تھک گئی ہو نگی ۔

جس روز صبح دلہن نے آنا تھا ،تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں ۔ مردانے میں ایک یا دو ملازم تھے باقی سب بارات کے ساتھ گئے تھے۔ وہ صبح آ ہی گئی ، صبح ہم لوگ تیار ہو کر پھاٹک پر پہونچ گئے ، پالکی آ گئی ، اب دلہن نیچے نہ اتری ، کافی انتظار کیا ، میری ٹانگیں دکھ گئیں ، مگر شوق تھا کہ کھڑے ہونے پر مجبور کر رہا تھا ۔

بھائی پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا ، چھوٹی بہن کو شدید کھانسی تھی ،امی اسے علیحدہ کمرے میں لیکر بیٹھی رہتی تھیں، میرا خیال ہے شاید بھائی بارات کے ساتھ چلا گیا ہو ۔ ایسے وقت میں وہ میرا بہت بڑا سہارا ہوتا تھا ۔

خدا خدا کر کے پردے پکڑے عورتیں آ کر کھڑی ہوئیں پردوں کے بیچ میں سے میری پھوپھیاں چل کر بگھی تک آئیں ۔ ملازم پیٹھ کئے کھڑے تھے ۔ بگھی کا دروازہ کھلا ، میرا دل دھک دھک کر رہا تھا ،میں نے کبھی دلہن نہیں دیکھی تھی ، دروازہ کھلا اور چند خواتین اتریں ،شاید ان ہی میں دلہن ہو گی، مگر نہیں دلہن لال سرخ کپڑوں میں تھی،انہیں پکڑ کر اتارا گیا ، وہ خراماں خراماں عورتوں کے جلو میں داخلی دروازے تک آ پہنچیں ، شاید کوئی رسم ہوئی

ہو ، میں سب سے پیچھے تھی،مجھے کوئ بھی نہیں دیکھ رہا تھا میں سردی سے کانپ رہی تھی ۔انتظار نے میری طاقت ختم کردی تھی ، خیر دلہن کو بڑے ہال کمرے میں بٹھایا گیا، گاؤ تکیہ لگا کر ، اس زمانے میں دلہن ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتی تھی ،آنکھیں بھی بند تھیں ۔

میں نے انکا چہرہ دیکھنے کی بہت کوشش کی مگر چہرہ نظر نہ آیا۔میں مایوس ہو کر باہر تخت پر آ کر بیٹھ گئ ۔ پھر پتہ نہیں اندر کیا ہوا ، چھوٹی پھوپھی کے زور زور سے ہنسنے کی آواز آرہی تھیں ۔وہ شاید دلہن کے اعزاز میں اپنی لکھی ہوئ نظم سنا رہی تھیں ، ایک مصرع مجھے یاد رہ گیا

" میرا بھیا ماہ کامل تو سراپا رنگ و نور"

میرا دل سخت اداس تھا میں اپنی امی کے پاس چلی گئ ، میری بہن ساری رات جاگ کر ابھی سوئ تھی ، میری امی نے مجھے باہر نکال دیا ،

شکرانہ بہت بڑے تھال میں بن کر آیا ، دلہن کو کھلایا گیا، پھر پتہ نہیں کیا ہوا یادیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں ، دو دن بعد پتہ چلا کہ دلہن چلی بھی گئیں ، میرے

دل میں ہوک سی اٹھی، کیسی دلہن تھی جس نے آنکھ اٹھا کر بھی مجھے نہ دیکھا ، میرے بھڑکتے ہوئے جذبات سرد پڑ گئے ، اپنی نوکرانی کی بیٹی کے ساتھ کھیلنے چلی گئی جسکا نام پھیکو تھا۔پھیکو کہنے لگی دلہن کو دفعہ کرو ۔

اچانک پانچ چھ روز بعد دلہن واپس آ گئی ، اب وہ ہنس بول رہی تھیں،مجھے اپنے پاس بٹھایا ، یہ وہ وقت تھا لگتا تھامیں نے کوئی ملک فتح کر لیا ہو ۔ میں سارا دن انکے کمرے میں گزارتی ، پڑھائی لکھائی کا ہوش نہ تھا ، ایک دن میری امی نے چچی جان کے سامنے میرے زور سے تھپڑ رسید کیا ، میں لرز گئی ، وہ شرمندگی ساٹھ سال بعد اب تک میری روح میں رچی ہوئی ہے ۔

میں چپ چاپ امی کے ساتھ چلی آئی ، میرے آنسو گلے میں اٹک گئے۔ رانی جو شادی پر آئی ہوئی تھی مجھے پیار کیا ،میں نے اسکی گود میں سر رکھ کر بتایا کہ مجھے تھپڑ مارا گیا ہے، اس نے مجھے ایک گانا سنایا ، پھر میں ٹھیک ہو گئی مگر چچی جان کے کمرے میں نہیں گئی ۔اب وہاں جاتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی ۔

میں نے پہلے جس کوٹھی کا ذکر لکھا ہے اس میں انوار احمد خان صاحب کو کرایہ دار رکھا گیا ، وہ پٹھان تھے اور نواب احمد علی خان بھی پٹھان تھے۔وہ بھی اباجی کی طرح باغ جانے لگے اور بالکل اباجی کی طرح اچکن اور صافہ باندھتے ۔ میں سنتی تھی کہ یہ بات ہوتی تھی کہ وہ اباجی کی جگہ لے لیں گے ۔ بہرحال اباجی پرانے تجربہ کار تھے اور سرکار کی تمام باتوں کا اباجی کو اچھی طرح پتہ ہوتا تھا۔

میں چلتے پھرتے سنتی رہتی ، دماغ تیز تھا ، تجزیہ بھی کرلیتی ۔ انکی بیگم کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ہماری دونوں پھوپھیوں سے انکی دوستی تھی-انکی بیٹی میری اور چھوٹی بہن کی سہیلی تھی ،ہم مل کر کھیلتے، وہ ہمیں گھر چھوڑنے آتی ، ہم انکو گھر چھوڑنے جاتے سارا دن یہی چکر رہتا۔

جب اسکے والد گھر آتے تو میں غور سے ان کو دیکھتی وہ کس طرح بیٹھتے ہیں، کس طرح دونوں میاں بیوی ایک جگہ کھاتے ہیں ، ان کے پلنگ بھی پاس پاس بچھے ہوتے تھے ۔ پتہ نہیں میرے دل میں ہوک سی اٹھتی کہ

ہمارے گھر میں ایسا کیوں نہیں ، ہمارے گھر کوئی کام سے اسطرح نہیں آتا تھا۔ نہ میری امی کے ساتھ کوئی بات کرتا ،

میں جیلس ہو جاتی ، ایک تڑپ سی میرے دل میں پیدا ہوتی ، آخر ہم کس کو ابو کہیں ، میری سہیلی ابو ابو کرتی ، انکو جوتے دیتی ، پانی پلاتی ، میں بہ حسرت و یاس اسے دیکھا کرتی ۔

باپ کا نہ ہونا بہت بڑا ظلم ہے ، یتیمی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلت و رسوائی نہیں ہے ، دروازے سے لگی سب نوٹ کرتی ، جب وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتے میں جل جاتی ۔ چپکے سے اسکی کتابیں پھاڑ دیتی ،اسکے کپڑوں پر مٹی گرادیتی ، کبھی بے طریقہ اسکو مارتی۔ میں اپنی دوست کے والدین کو اکٹھا نہیں دیکھ سکتی تھی عجیب طرح کا حسد پیدا ہوتا ، بچپن تھا ، یہ جذبات کسی کو بتائے نہ جاسکتے نہ ہی اتنی گویائی میں طاقت تھی۔ کہ کسی سے یہ دکھ بانٹا جا سکتا ۔ نتیجہ میں اسکو نقصان پہنچاتی ۔ اس سے پانی مانگتی پھر گلاس جان بوجھ کر زمین پر دے مارتی ۔بس یہی اس دکھ کا ذریعہ اظہار تھا ۔

لڑکیوں کو باپ کی بہت چاہت ہوتی ہے - باپ ہو تو صحیح ، باپ کہاں تھا ، کیا پتہ کون تھا ، ہمیں تو نام بھی نہیں آتا تھا۔ایک دفعہ استانی نے پوچھا تمہارے والد کیا کام کرتے ہیں ۔ میں نے اباجی کا بتایا کہ وہ باغ جاتے ہیں ، کہنے لگی وہ تمہارے دادا ہیں ۔ میں چپ ہوگئی پھرانہوں نے میری چھوٹی بہن کو بلا کر پوچھا کہ تمہارے والد کا کیا نام ہے ، وہ شرمندہ سی ہوکر چپ ہوگئی ، سب ہنسنے لگے ۔

ہمارے بڑوں کو یہ سب کچھ ہمیں بتانا چاہیئے تھا مگر اس خیال سے شاید ہمارے دل نہ دکھیں ، ذکر ہی نہ کیا جاتا ۔ ہمیں اپنے والد کا نام بہت بڑے ہو کر پتہ لگا ۔

ہمارے گھر کے ساتھ جہاں پھاٹک ختم ہوتا تھا ، ہمارے دادا کے بڑے بھائی کی حویلی تھی ، وہ ڈاکٹر تھے اور مشہور و معروف تھے ۔عید کی صبح ہمیں ان سے چار آنہ عیدی ملتی تھی ۔عید کی صبح امام بخش جو انکا خدمتگار تھا ہم تینوں بہن بھائیوں کو بلانے آجاتا ، پھر عیدی ملتی ۔

یتیمی ایسا داغ ہے جو تمام عمر نہیں مٹتا ، یتیم بچوں کی کوئی عزت نہیں ہوتی ۔ مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے ۔

1944ء میں بڑے اباجی کا انتقال ہوگیا ،سرکار خود تعزیت کیلئے آئے ۔بڑی بات تھی ان کا آنا اورفاتحہ پڑھنا ۔ صبح سے پولیس ہماری حویلی کے گرد تھی ۔ اگلے روز چاروں بیگمات تشریف لائیں-

بڑی بیگم روتی رہیں۔انکی خدمات کا ذکر کیا ۔کنیزوں نے پان بنائے ،انہوں نے فاتحہ پڑھی اورچلی گئیں ۔

انوار احمد خان صاحب سرکار پر چھا چکے تھے، انکی بیگم فرشی سلام کرتے ہوئے بیگمات کو اندر لائیں ۔ وہ رکوع میں جھک کر سلام پیش کرتیں-ہمارے ہاں کسی نے فرشی سلام نہیں کیئے ۔

کسی انسان کے آگے جھک جانا عجیب سا لگتا ہے ۔

اسی طرح وقت گذر رہا تھا ۔اب کافی سمجھ آ گئی تھی برا بھلا پتہ لگ رہا تھا ۔ اب میں نوکرانی کے بچوں کو بھی نہیں مارتی تھی ۔

ایک دفعہ کہیں سے کھجوروں کا ٹوکرا آیا۔ میں حسب عادت بڑھ کر اٹھانے لگی ، میرے بھائی نے میرا دامن کھینچا اور چلا گیا، میں بھی چلی گئی۔ ورنہ میں اس معاملے میں بہت بے شرم تھی۔ میرے بہن بھائی انا والے تھے بہن سمجھدار تھی، وہ زیادہ تر ننہیال میں رہنا پسند کرتی، میری ننہیال کے لوگ سادہ طبیعت تھے۔ سادگی سے رہتے ، انکے رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ نہیں تھے۔

میں زیادہ تر دودھیال میں رہتی مجھے اپنے چچا پھوپھیاں بہت اچھی لگتی تھیں، میں ہر بات میں انکی نقل کرتی۔

میری والدہ بالکل خاموش رہتیں ، انکا تو سب کچھ پامال ہو گیا تھا۔ ان کے سب اچھے کپڑے زیور سب بکسوں میں بند ہو گئے تھے۔

ہمارے والد کا سامان بھی ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا- کبھی چچا جان کو ضرورت پڑتی تو وہ بند کمرہ کھولا جاتا۔ میں دوڑ کر جاتی کہ دیکھوں اس میں کیا ہے۔ تمام نادر اشیاء تھیں۔ میرے والد رئیس زادے تھے۔ بے تحاشہ سامان تھا - ایک دفعہ شاید چچا جان کو بندوق کی ضرورت تھی شکار کیلیئے- کمرے میں کئی طرح کی بندوقیں تھیں -

چچا جان کمرے سے نکل کر بے چین ہو جاتے ، میں انکے ساتھ رہتی ، وہ اکثر روتے ، ہم دونوں بہنوں کو گود میں بٹھا لیتے ۔جب آئی سی ایس کا رزلٹ آیا گھر میں خوشی منائی جا رہی تھی ، ہار پھول مٹھائی آ رہی تھی ، چچا جان ہم دونوں بہنوں کو گود میں لئے رو رہے تھے وہ ہمیں بہت ہی پیار کرتے ، کبھی ڈانٹا نہیں ۔ کبھی بری آنکھ سے نہیں دیکھا تھا جب کبھی وہ آتے میں انکے سر میں تیل لگاتی ، کنگھی کرتی وہ سو جاتے ۔

چھوٹے ماموں ملازم ہو کر میرٹھ چلے گئے تھے ہماری نانی بھی انکے ساتھ چلی گئیں ۔خالاؤں کی شادیاں ہو گئیں ۔

1946ء میں پھوپھی کی شادی بھی ہوگئی ۔ ان کی بارات تین دن تک رہی ، ڈھائی تین سو افراد تھے ، انہیں بہت بڑا جہیز دیا گیا اور وہ بیاہ کر امرتسر چلی گئیں ۔شریف پورہ انکے دادا سسر کا تھا ،معلوم نہیں اب اس جگہ کا کیا نام ہے وہ بہت بڑے زمیندار لوگ تھے

بڑی پھوپھی اپنے بیٹے (فرخ حسن) کے ساتھ چلی گئیں ۔گھر بالکل سونا ہو گیا- ہماری دادی، پھوپھی کے جانے کے بعد اداس رہنے لگی تھیں ، مجھے

زیادہ تر اپنے ساتھ رکھتیں۔ وہ تہجد گزار تھیں ، بے انتہاء عبادت کرنے والی تھیں ، ہمیشہ ہم ان کو جاء نماز پر دیکھتے تھے پھر وہ بھی چلی گئیں۔ ہم بالکل اکیلے رہ گئے۔ اتنی عظیم الشان حویلی میں ہم تین بہن بھائی اور والدہ ۔

اسی عرصے میں نواب صاحب کی بیٹی شوکت بیگم نے اباجی کو باؤنی کدورے بلا لیا – وہ وہاں چیف منسٹر ہو کر چلے گئے۔ کبھی کبھی آتے۔ باہر نکلنا بند ہوگیا تھا۔

ملازم بھی کم ہوگئے تھے ۔رونقیں ختم ہو رہی تھیں ، بلکہ ختم ہوچکی تھیں بڑے کمرے بند رہتے ، ہم اپنا گھر چھوڑ کر بڑی حویلی میں آگئے تھے ۔

اب کے بسنت کا موسم آیا تو کوئی شور شرابہ نہ ہوا ، سب لڑکیاں بیاہ کر چلی گئی تھیں۔ کرکٹر سکندر بخت کی پھوپھیاں بھی چلی گئیں ۔جواں بخت شاید انکے والد کا نام تھا۔ انہیں امین بھی کہتے تھے ۔

یہ سب لڑکیاں بسنت پر زرد کپڑے پہنتیں ۔ بڑے بڑے برآمدوں میں جھولے ڈالے جاتے ، پکوان تلے جاتے ، خوب شور مچتا ۔مگر یہ سب کچھ حویلی کی چار دیواری میں ہوتا ۔ باہر کی کسی تفریح کا کوئ تصور نہیں تھا ۔ لڑکیاں گھروں میں پڑھتیں ، ماسٹر پڑہانے آتے ، اردو ، انگلش ، حساب سب پڑھایا جاتا ۔ برادری کے بزرگ پڑہانے آتے باہر کا کوئ ٹیوٹر اندر نہیں آسکتا تھا ۔

بڑے اباجی کے بیٹے شوقین مزاج تھے ، انکے گھر ریڈیو بھی تھا ، گراموفون بھی تھا اس میں ریکارڈ لگاتے تھے ۔ ریکارڈ کالے رنگ کے ہوتے اور اوپر ہز ماسٹر وائس لکھا ہوتا ۔ وہ ستار بھی بجاتے تھے۔ کبھی کبھی گراموفون منگوا کر ریکارڈ سن لیتے ، زیادہ تر نعتوں کے ریکارڈ ہوتے ۔

اباجی ایک دفعہ باؤنی کدور سے آئے اور ہمارا سکول بند کرا دیا۔ میں بہت روئ مگر حکم صادر ہو چکا تھا ۔ گھر پر ماسٹر پڑھانے لگے ۔ مجھے اپنی سہیلیاں یاد آتیں ، سکول یاد آتا ۔ اگر ہماری دادی زندہ ہوتیں تو سکول کبھی بند نہ ہوتا ۔

بواءجی کی وفات بہت دکھ دینے والا سانحہ تھا۔ وہ فرشتہ صفت خاتون تھیں ۔ اللہ انکو جنت نصیب کرے ۔

ایک دفعہ جاپان سے ایک تاجر کھلونے لے کر آیا ۔ بواء جی نے کہا باہر جاؤ اپنی پسند کے کھلونے لے لو ۔ میں نے ایک گڑیا لی ۔میرے بھائ نے ڈرم میں بیٹھا گڈا لیا بہن نے پتہ نہیں کیا لیا یاد نہیں-بواءجی کی وجہ سے ہمیں کھلونے ملے لیکن ظالم بھائ نے اگلے دن گڑیا کا آپریشن کر دیا۔ وہ دکھ مجھے اب تک یاد ہے ۔

بچپن میں خواب نظر آتا کہ بھائ میرے کھلونے توڑ رہا ہے ، میں چیخ مار کر اٹھ کر بیٹھ جاتی ۔ اپنی تمام چیزیں تالے میں رکھتا ، میری رسائ اس تک نہیں تھی ۔میں بہت کوشش کرتی مگر اسکا مجھے کچھ بھی نہ ملتا ۔میں اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتی ۔ جب ٹائم پیس والا قصہ ہوا تو میں اندرہی اندر خوش ہوئ کہ اب بھائ کو مار پڑے گی ۔مگر دونوں طرف سے کوئ رد عمل سامنے نہ آیا۔ میں سخت مایوس ہو گئ ۔

مجھے تو ہر وقت ڈانٹ پڑتی تھی ، یہی وقت تھا کہ میری خواہش کی تکمیل ہو مگر وائے ناکامی کسی نے بھی بھائی کو ایک لفظ نہ کہا ۔ میرا بھائی کتنا خوش قسمت تھا ۔

بھائی کا رنگ کالا تھا کبھی شیشہ دیکھتا تو کہتا ، آج میں اچھی طرح صابن سے منہ دھو کر گورا چٹا بنونگا ۔

یہ بہت بچپن کی باتیں ہیں ۔ چھوٹی چھوٹی معصوم باتیں ، معصوم خواہشات ۔

ہماری پریم تھی ، ہم تینوں بہن بھائی پریم میں بیٹھتے یہ بھی بہت بچپن کی بات ہے ، چھانگا پریم چلاتا ۔ میری چھوٹی بہن رونا شروع ہو جاتی ، اسکو اتار دیتے ، ایک دن ہم تینوں بہن بھائیوں کو بٹھا کر وہ سڑک تک لے آیا ۔ میری بڑی پھوپھی کے بیٹے جن کا نام فرخ ہے انہوں نے کتے کو گاڑی سے باندھ دیا ، وہ بھاگا اور ہم بہن بھائی سڑک پر گر گئے ۔ بس اتنا ہی یاد ہے پھر اسکے بعد کیا ہوا ہو گا ۔

کتا مظہر چچا کا تھا ، انکے پاس بے تحاشہ چیزیں تھیں ، ایک کتا بھی تھا جس کا نام ٹامی تھا ۔

ہمارے ٹرائیسکل بھی تھے ، بھائ کا ٹرائیسکل زنجیر والا تھا ۔ جب مجھے غصہ چڑھتا اسکی زنجیر اتار دیتی ۔ بھائ نانی صاحبہ سے شکایت کرتا تو وہ کہتیں اس کو میں تیرے اوپر سے وار کر پھینک دوں گی ۔

کس قدر دل خراش باتیں تھیں ۔ میرا ننھا سا دل خون کے آنسو روتا ۔ بھائ بہت خوش ہوتا ۔

ہماری دادی کی ایک بہن تھیں وہ بہت غربت میں گذارہ کرتی تھیں ،انکے بیٹے زاہد حسین ، گورنر سٹیٹ بینک آف پاکستان بنے ۔ ان کا بیٹاناصر چیف جسٹس آف سندھ بنا ۔

جب انہوں نے آئ سی ایس کیا تو یہ باتیں سب ایک دوسرے سے کرتے تھے ۔ کیونکہ وہ بڑے افسر بن گئے تھے ۔ان کے والد شاید انکا خیال نہیں کرتے تھے ، سنا سٹریٹ لیمپ کی روشنی میں پڑھتے تھے ۔ اللہ

تعالی نے انہیں بہت عزت دی ۔ وہ کبھی کبھی مالیرکوٹلہ آتے اور سری پائے کی فرمائش کرتے ۔کہتے سب کھا چکا ہوں میرے لئے سری پائے پکوا دو ۔

بچپن میں ہمیں قطعا احساس نہیں تھا کہ ہم کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتے ہیں ۔ لڑکیاں اپنے گھروں کے قصے سناتیں حالانکہ انکے گھر ہمارے مقابلہ میں بہت چھوٹے تھے ۔

ایک روز میں نے اپنی بڑی پھوپھی سے کہا کیا ہمارا گھر بڑا ہے ۔ وہ ہنسنے لگیں پھر انہوں نے بتایا کہ سب کے گھروں سے ہمارا گھر بڑا ہے - تب خیال میں آیا ۔

میں لکھنا بھول گئی توشہ خانہ میں رول کے رول قالین رکھے تھے ، جو فنکشنوں پر بچھائے جاتے تھے ۔ ایرانی نرم قالین اور گاؤ تکیے ۔

بازار جانے کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔ بزاز کپڑوں کے تھان لیکر آجاتے ۔تھان اندر آتے اور کپڑا پسند کر لیا جاتا ۔ بزاز کپڑے ناپ ناپ کر پھاڑتے جاتے ۔

اسی طرح زیورات پسند کر لئے جاتے ۔ سنارے خود چل کر آتے ۔ پھوپھی کی شادی کے تمام زیور اسی طرح آئے ۔ چچا جان کی شادی کے مجھے یاد نہیں ۔

موچی ناپ لے جاتے اور جوتا بنا کر دے جاتے ۔ ہماری کوئی رشتہ دار لدھیانہ میں تھیں ایک دفعہ ہماری بڑی پھوپھی وہاں گئیں تھیں اور بہت کپڑ ا جوتے لائی تھیں ۔ یہ کام بہت خاموشی سے ہوا تھا شاید اباجی تک کو پتہ نہیں لگا ۔

جو رشتہ دار دور رہتے تھے بریلی وغیرہ میں وہ بھی کافی سامان بھیجتے تھے جو اس وقت کے مطابق جدید سامان ہوتا تھا ۔ جو چپکے سے بری جہیزوں میں رکھ دیا جاتا تھا ۔

کچھ نام ملازمین کے بھی لکھ دوں آنے والی نسلیں واقف ہو جائیں گی

عبداللہ : ایک ایسا کردار تھا جو منفرد عادات رکھتا تھا ۔ اگر کبھی اسکی روٹی میں کمی بیشی ہو جاتی تو روٹی ڈیوڑھی میں پھینک کر چلا جاتا ۔ یا ترازو میں

ایک طرف روٹی اور ایک طرف آدھ کلو کا بٹہ رکھ کر لاتا کہ دیکھو روٹی ایک چھٹانک کم ہے ۔ اسکی صبح شام پانچ موٹی موٹی روٹیاں پکتی تھیں جو وہ ترازو سے تول کر کھانے بیٹھتا ۔ صرف میری چھوٹی پھوپھی کو آواز دیتا جنہیں منی کہتا تھا ۔

عطو : یہ اباجی کا خدمتگار تھا ، اباجی کی پوری خدمت اس کے ذمہ تھی، وہ دن رات کا ملازم تھا اورحویلی میں ہی عبداللہ کی طرح رہتا تھا ۔ وہ گھر والوں کی بہت عزت کرتا ۔ اباجی کی ایک ایک چیز کی حفاظت کرتا ۔ مہمانداری بھی جو باہرہوتی اسکے ذمہ تھی ، دھلے ہوئے صاف کپڑے پہنتا ،سر پر صافہ باندھتا ۔اسکو کھانے سے غرض نہیں تھی اسکے بیوی بچے نزدیک کہیں رہتے تھے ۔ عبداللہ کی طرح غصہ بھی نہیں کرتا تھا ۔

چھوٹا: یہ بھی باہر کا ملازم تھا ، کرسیوں وغیرہ کی صفائی ، دیواریں جھاڑنا اور چچاؤں کے کمروں کی صفائی اسکے ذمہ تھی ۔

نیامت ، فیری اور کیسو : نیامت گھر کا کھانا پکاتی ۔ باریک پھلکے

پکانا ، مصالحہ پیسنا ، وہ بھی طریقہ سے دونوں وقت کھانا وہی پکاتی ۔

اس زمانے میں سل بٹے پر مصالحے پیسے جاتے تھے ۔ جو کافی

وقت طلب کام تھا ، یہ تینوں خادمائیں باری باری کام کرتی تھیں ۔

نیر: ایک لڑکا جو دس بارہ سال کا تھا فرشی پنکھے کھینچتا تھا ، دوپہر کو آتا

شام کو چلا جاتا ۔

رحیمن: یہ مراثن تھی تیل لگاتی بال بناتی ، روزانہ آتی تھی

کمی: یہ نائن تھی اور آٹھ دن بعد آتی اور غسل کا انتظام کرتی

سب کے سر دھوتی ، تیل لگاتی ۔

شرفو: یہ بھی اندر کا پنکھا چلاتا تھا ، اسکا بھائی بھی یہ کام کرتا تھا

کھیتو: یہ بھی کھانا پکاتی تھی کیونکہ بیک وقت چالیس پچاس آدمیوں

کا کھانا پکتا تھا ۔

یہ خاص خاص لوگ تھے جو وفادار اور خدمتگار تھے ۔

بجلی کے پنکھے نہیں ہوتے تھے ، چھتوں سے رسیوں کے ذریعہ کپڑے اور ٹاٹ کے پنکھے لٹکے ہوتے تھے، جنہیں ساری دوپہر ملازم کھینچتے تھے ۔ یہ تو بہت ہی عجیب بات تھی کہ سارا گھر کمروں میں سو رہا ہے اور یہ غریب لوگ پنکھے کھینچ کر انہیں سلا رہے ہیں، شام گئے انہیں چھٹی ملتی تھی ۔

کئی ملازم صرف پنکھوں کیلیۓ رکھے گئے تھے ۔ ہر کمرہ کیلیۓ ایک ملازم تھا ۔ وہ دیہاڑی دار مزدور تھے ، شام کو دو پیسے یا ایک آنہ جس میں چار پیسے ہوتے تھے انکو دئے جاتے ۔

میں نے پہلے بھی لکھا ہمارے نانا صاحب کئی مہینہ بعد آتے تھے ۔ بھائی کوئی چیز انکے پلنگ کے نیچے پھینکتا پھر مجھے کہتا تم جھوٹ موٹ رونا، میں رونے کی پوری ایکٹنگ کرتی ، وہ پوچھتے کیا ہوا ، میں کہتی میرے کچھ پیسے پلنگ کے نیچے بھائی نے پھینک دئے۔ وہ ہمیں دونوں کو ایک ایک روپیہ دیتے ۔ یہ

سازش بھائی نے بنائی تھی ۔ جس کا مرکزی کردار میں ادا کرتی ، وہ روپیہ ہمارے لئے بہت بڑی چیز ہوتا اور ہم یہ اکثر کرتے تھے ، ہماری چھوٹی بہن لاتعلق رہتی تھی اسکو ہم کچھ پیسے دے دیتے ، وہ خوش ہو جاتی ، وہ تو اتنی سیدھی اور بھولی تھی ۔گوشت میں جو گلی ہوتی وہ بھائی کو دی جاتی ، وہ کسی چیز کی ضد نہ کرتی صرف ہڈی میں سے جو کالے رنگ کا گودا نکلتا وہ اسے پسند تھا ۔میری امی ہڈی خالی کر کے گودے کی جگہ آلو بھر دیتیں ، وہ مزے لیکر کھاتی ۔گودا بھائی کو دیا جاتا ہمارے ذہنوں میں بھائی ایک جادوئی ہستی تھا جس کو کچھ نہ کہا جا سکتا ۔ایک دوپہر جب حویلی سنسان ہو گئی بھائی نے ہم دونوں بہنوں کو سر پر مار دیا ۔

چھوٹی بہن کہنے لگی چلو بدلہ لیتے ہیں، امی سو رہی ہیں ، اسے کمرے میں بند کر کے کنڈی لگاتے ہیں ۔ہم دونوں بہنوں نے اسکو کمرے میں بند کر کے کنڈی لگا دی ، کافی دیر وہ کھڑکاتا رہا ، ہم نے کہا پہلے توبہ کرو پھر کھولیں گے ، اس نے توبہ نہ کی ، اب کافی دیر ہو گئی تھی ، شام کا کھاناچائے بنانے والی ملازمہ

آگئی تھی ۔اس نے دیکھا تو کنڈہ کھول دیا ، بھائی پسینہ سے شرابور تھا ۔ پھر جو کچھ ہوا آپ اندازہ لگالیں ۔

ہمارے چھوٹے ماموں میرٹھ سے لکھنئو آ گئے ، گرمیوں کی چھٹیوں میں انہوں نے ہمیں بلایا ۔وہ جس کوٹھی میں رہتے تھے اسکے بارہ کمرہ تھےاور وہ کوٹھی مال روڈ پر تھی ، اسکے لان میں بارہ درخت آموں کے تھے جن میں کھٹی کھٹی کیریاں لگی ہوئی تھیں ۔ ایک درخت امرود کا تھا،دو درخت بیر کے اور ایک پھل کٹھل ہوتا ہے ، مالکت بھی ایک پھل ہوتا ہے اسکے بھی درخت تھے ۔ لیچی کا درخت تھا ، لیموں کے تین چار درخت تھے کوئی پھل ایسا نہ تھا جو اس کوٹھی میں نہ ہو ۔ املی کا بہت بڑ ادرخت تھا ۔ میٹھی میٹھی املی اب بھی یاد آتی ہے ۔

آم پکنے سے پہلے اباجی کا بلاوہ آ گیا کہ گھر آؤ ۔ ہم بادل نخواستہ گھر کیلئے روانہ ہوگئے ۔

وہاں بندر بہت تھے ، جو روزانہ کوئی نہ کوئی چیز اٹھا کر لیجاتے ۔ ایک دفعہ پوری روٹی اٹھا کر لے گئے ، پکے ہوئے چاولوں کی دیگچی اٹھا کرلے جاتے ،

ہم تالیاں بجاتے تو بندر بھی تالیاں بجاتے ، بڑا مزہ آتا دوپہر کو املی کی گٹاریں ، کچی کیریاں نمک مرچ لگا کر کھاتے -

دو مہینے سے پہلے ہم واپس آ گئے - لکھنؤ میں ہم نے سیریں بھی کیں جو مالیر کوٹلہ میں منع تھیں ۔

پاربتی اور گنگا دونوں ماں بیٹی کوٹھی میں رہتی تھیں اور ہماری نانی صاحبہ کے کام کرتی تھیں ہندو ہونے کے باوجود بہت اخلاص اور محبت سے کام کرتی تھیں ۔

یہاں بھائی نے بہت ساری املی توڑ کر ڈبہ بھر لیا ۔ گھر آ کر ایک املی بھی کھانے کو نہیں دی ۔ سب تالا لگا کر رکھ لیں ، ایک ماہ بعد جب نکالیں تو اس میں کیڑے پڑ گئے تھے -

دوسری جنگ عظیم میں ہمارے گھر میں دو فریق بن گئے میری چھوٹی پھوپھی اتحادیوں کی طرفدار تھیں اور دونوں چچا نازیوں کی طرف ۔ اکثر مزیدار لڑائی ہوتی ۔

چچا جان چرچل کی تصویر پر تھوک کر بھاگ جاتے تو پھوپھی رونا شروع کر دیتیں۔ بعض اوقات دونوں بہن بھائیوں میں دلچسپ مباحثہ ہوتے مگر تکرار تہذیب کے دائرے میں رہتی ۔

ایک دفعہ مالیر کوٹلہ میں کسی جگہ پر وجیکٹر پر ڈرامہ دکھایا گیا - بڑے اباجی کے چھوٹے بیٹے مظہر چچا نے سب عورتوں کو لیجانے کا پروگرام بنایا ۔مگر یہ سب کچھ رات کو چوری سے ہونا تھا۔ دس بجے کے قریب ان کی ملازمہ نے آ کر بڑی پھوپھی کے کان میں بات کی ۔سب اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے ۔

میں بڑی پھوپھی کے پاس تھی ۔ میری دونوں پھوپھیوں نے اور میری دونوں خالاؤں نے لحاف رول کر کے اوپر چادریں ڈال دیں اور اپنے کمروں سے نکل کر صحن میں آ گئیں ۔

جہاں دو خادمائیں منتظر تھیں وہ ان چاروں کو لیکر مظہر چچا کے گھر آئیں میں ساتھ تھی لیکن میرے بھائی بہن سو رہے تھے ۔ پھر سب اکٹھے ہو کر ایک

جج کے گھر گئے جہاں پروجیکٹر لگا ہوا تھا۔ بہت خواتین وہاں بیٹھی تھیں ۔ میں سو گئ اور ڈرامہ نہ دیکھ سکی ۔آنکھ کھلی تو اپنے بستر پر تھی ۔

میں آجکل کے زمانے کو اور پچھلے ادوار کا موازنہ کرتی ہوں- اب تو کھلے بندوں یہ سب کچھ ہوتا ہے ، کوئ روک ٹوک نہیں میڈیا نے بے حیائ کو فروغ دیا-

جب پاکستان نہیں بنا تھا تو ہم سب بچے زور زور سے گاتے تھے قائداعظم کا فرمان لیکر رہیں گے پاکستان ۔

پھر آخرکار پاکستان بن گیا۔

ہمارا بہت خوبصورت گڑیا گھر تھا ، کسی کاریگر نے بڑی محنت سے لکڑی کا گھر بنا کر دیا تھا۔اچھا بڑا سا گھر تھا جس میں کمرے برآمدے کچن ، چھت پر دو کمرے تھے ، میں اور میری بہن ثمینہ دونوں اس میں اپنی گڑیاں رکھتے تھے ، ہماری بڑی خالہ جنہیں آلاجی کہتے تھے ، وہ کپڑے کی بہت خوبصورت گڑیاں بناتی تھیں ، مگر بھائ ہر دوسرے تیسرے روز انہیں چیر پھاڑ دیتا تھا۔

وہ بھائی کو ایک لفظ نہ کہتیں اور نئی بنا دیتیں،اور پھر وہ انکا بھی وہی حشر کرتا
۔ یہ تماشہ شب و روز ہوتا۔

بھائی جسمانی طور پر کمزور تھا ، اکثر بیمار ہو جاتا تھا ، وہ دن میرے چین و سکون کے ہوتے حالانکہ بھائی کی بیماری سے دل بہت دکھتا ۔ مجھے یاد ہے اکثر اسکے دانت نکلوائے جاتے ، میری امی پر وہ وقت بہت شاق گذرتا وہ روتی تھیں ۔

بھائی کی تو ذرا سی تکلیف انہیں تڑپا دیتی تھی ۔ انہیں بھائی سے عشق تھا اب بھی خوابوں میں وہ گڑیا کا گھر نظر آتا ہے ، ہمارے پڑھنے کے بہت خوبصورت ڈیسک تھے اور فرشی رائٹنگ ٹیبل تھیں شاید ہم امیر بچے تھے ۔ یا امیر گھرانے سے تعلق رکھتے تھے ۔

جب ہم 1948ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تو دو کمرے اپنے سامان کے بھرے ہوئے چھوڑ کر آئے ۔

گڑیا کا گھر چچا نے نہیں لانے دیا ، ڈانٹ کر واپس رکھوا دیا ، ہمارے پاس کہانیوں کی بہت کتابیں تھیں ، بھائی کو کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا ۔ انگریزی سٹوری بکس لکھنئو میں ہماری ایک دوست نے دی تھیں ، اسکا نام انجلی تھا ، اسکے پاپا بنگالی ہندو تھے اور ماما امریکن تھیں۔انجلی کی چھوٹی بہن نومیا تھی جو نو ماہ کی تھی ۔

انجلی کی ممی ہم سے بہت پیار کرتیں جب ہم جاتے تو وہ کھانے کیلیئے بنگالی مٹھائی دیتیں ، اور کتابیں گفٹ کرتیں ۔ انجلی سارا دن ہمارے ساتھ کھیلتی اسے ہمارا کھانا پسند تھا ۔ ہمارے ساتھ نماز پڑھتی ۔لیکن اسکی ماما منع نہیں کرتیں ، وہ پیل روڈ پر رہتے تھے گھر ساتھ ساتھ تھے ۔ انکے پاپا کرنل تھے اور کرنل دیو کہلاتے تھے ۔

جہاں ماموں کی کوٹھی ختم ہوتی پیل روڈ شروع ہو جاتی ۔

مالیرکوٹلہ واپس آ کر پھر پڑھائی کا چکر شروع ہو گیا ، قرآن شریف بھی روزانہ پڑھنا ہوتا تھا ۔

بھائی کی پیدائش پر بہت خوشیاں منائی گئی تھیں ، سنا ہے صبح سے شام تک پیسے اور گڑ کی بھیلیاں بانٹی گئیں حتی کہ اباجی کی انگلیاں پیسے بانٹ بانٹ کر سبز ہو گئیں تھیں ، کثرت سے صدقہ و خیرات کیا گیا ۔

میری پیدائش پر سب کو یقین تھا کہ پھر بیٹا ہو گا مگر میں ہو گئی ۔ لیکن اباجی نے اسی طرح پیسے بانٹے ، پیسے تانبہ کے ہوتے تھے اور جارج ششم یا انکے والد جنکا سر گنجا تھا انکی تصویر بنی ہوتی تھی ۔

میرے والد میرے دادا کے بڑے بیٹے تھے، انکی شادی پر بھی بے تحاشہ صدقہ کیا گیا ، میری امی کی ڈولی پر آرسیاں نچھاور کی گئیں ، آرسی شیشہ لگی انگوٹھی ہوتی ہے ، چاندی کی بنتی تھی ۔

سنا اس روز کنوؤں پر جال ڈال دیئے گئے تھے اس قدر رش تھا کہ ہلاکتوں کا خدشہ تھا ۔

میری امی پاؤں نیچے اتارتیں تو دو خادمائیں دوڑ کر جوتے پہنانے آتیں مگر صد افسوس سب تباہ ہو گیا ۔

میں نے شروع میں لکھا تھا کہ معلوم نہیں کوٹھی کس مقصد کیلیئے بنائی گئی تھی۔ بھائی سے استفسار پر معلوم ہوا کہ بہت بڑا باغ تھا جس میں طرح طرح کے پھلوں کے درخت تھے ، میری والدہ بتاتی تھیں کہ صبح صبح بے تحاشہ پھل باغ سے اتر کر آتا تھا۔

مگر ایک مرتبہ بہت بڑا ڈاکہ پڑا اور ڈاکو سیروں کے حساب سے سونا لوٹ کر لیگئے ، اباجی کو کسی نے بتایا کہ ڈاکو رات کو باغ میں چھپے تھے ۔ یہ سنتے ہی اباجی نے ہرے بھرے پھلوں کے درخت کھڑے کٹوا دئے اور وہاں کوٹھی کی بنیاد رکھ دی ۔

اس کوٹھی کی جگہ ایک ہرا بھرا باغ تھا۔ پھلوں کے درخت نہیں کٹوانے چاہیئیں ، جوان بیٹا داغ مفارقت دے گیا۔ لوگوں نے یہی کہاکہ پھلدار درخت کٹوانا بہت گناہ ہے ۔

کوٹھی بہت عظیم الشان تھی جس میں ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا جسکے چاروں طرف بیڈ رومز تھے ۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ اباجی بہت سارے نوٹ لیکر آئے اور بواءجی کو دئے ،پھر کہنے لگے کہ بنت ضلع مظفر نگر کے باغ بک گئے ہیں ۔میں نے یہ بات ابا جی سے سنی پھر دوڑ کر بھائی کو بتائی ۔

میری پھوپھی کہتی تھیں کہ ہم آم کی گٹھلی نہیں چوستے کیونکہ ٹوکروں کے حساب سے آم گھر میں آتا تھا۔ بنت میں بہت بڑے باغ تھے ،ہمارے آباء و اجداد بنت ضلع مظفر نگر سے آئے تھے ۔

وہاں کا ہر ہر لمحہ میرے ذہن میں ہے ۔

چھوٹے صحن چار تھے جو حویلی کے چاروں کونوں میں تھے، وہاں پھول اگائے جاتے تھے انہیں چمن کہتے تھے ۔ ہر ڈرائنگ روم کے آگے برآمدے کے بعد چھوٹے صحن آتے ۔ جہاں چمن کہلائے جانے والے پھول بوٹے اگائے جاتے تھے ۔ وہ پھول بہت خوشنما لگتے ۔

اب جب خواب نظر آتا ہے تو اسی گھر کا نظر آتا ہے ۔

ساٹھ سال گذر گئے کچھ اچھی یادیں کچھ خوفناک یادیں جن میں سٹور میں کھڑی ہوئی چڑیل کا ہونا ، میری بڑی خالہ جنہیں ہم آلاجی کہتے تھے ۔جب ہمیں ڈرانا مقصود ہوتا وہ چڑیل دکھاتیں ، ایک لمبے بانس پر کپڑا باندھ کر سٹور میں کھڑا کر دیتیں ۔ پھر کہتیں آج چڑیل آگئی چلو دکھاؤں اس چڑیل کو دیکھ کر ہمارا دم نکل جاتا ۔

زیادہ تر مجھ غریب کو ہی ڈرایا جاتا اور مجھے ہی اب وہ چڑیل خواب میں نظر آتی ہے ۔ مجھے اکثر و بیشتر شرارتوں کے عوض اس چڑیل کے ساتھ بند کیا جاتا ۔ میں کس کر آنکھیں بند کرلیتی اور زور زور سے چلاتی تھی۔پھر مجھے کھول کر توبہ کرائی جاتی وہ تو صرف چند گھنٹوں کیلئے ہوتی تھی۔

ہم تینوں بہن بھائی اکثر ایک پلنگ پر لیٹتے ۔ بھائی ڈرتا تھا ۔وہ ہم دونوں بہنوں کے بیچ میں لیٹ جاتا ۔

ہماری نانی صاحبہ رات کو ہمیں کہانیاں سناتی تھیں ، کافی کہانیاں مجھے یاد ہیں جو میں نے علیحدہ لکھ لی ہیں ۔

بواء جی کبھی کہانی نہیں سناتی تھیں بلکہ وہ اخبار وغیرہ پڑھ کر سنتی تھیں۔ ہمیں تو بہت بعد میں پتہ لگا کہ وہ ہماری دوسری دادی تھیں ، مگر شفقت محبت میں کبھی کمی نہ آنے دی ۔ محبت کا زم زم بہتا تھا۔ اتنا خیال اتنا پیار شاید سگی دادی بھی نہ دے سکتیں ۔

میری بڑی پھوپھو اور والد پہلی دادی سے تھے ۔ میری بڑی پھوپھی سعیدہ میری دادی سے بے انتہاء پیار کرتیں اور وہ بھی بہت خیال اور عزت کرتیں ۔

پورے گھر پر میری پھوپھی کا راج تھا ۔ان کے حکم کے بغیر پتہ بھی نہ ہلتا۔ سڑک پر چلتی بارتیں انکے حکم کے بغیر باجہ نہیں بجاسکتی تھیں ۔انکی بارات کو دس دن ٹھہرایا گیا۔میرے پھوپھا ظاہر اباجی کے درمیان والے بیٹے تھے وہ بھی گریجویٹ تھے ۔ بڑے ابا جی کے بڑے بیٹے ڈبل ایم اے تھے اور چھوٹے وکیل تھے۔ بڑے اور چھوٹے بیٹے لا ولد تھے مگر درمیان والے جو میرے پھوپھا تھے انکے تین بیٹے ہوئے ، دو اللہ کو پیارے ہو گئے ۔

یہاں میری آپ بیتی کا اختتام ہوتا ہے

امینہ عزیز

یکم جولائی 2007ء

جن رشتہ داروں کا والدہ نے اپنی خود نوشت میں

ذکر کیا ہے ان میں سے جن کی تصاویر مجھے مل سکیں

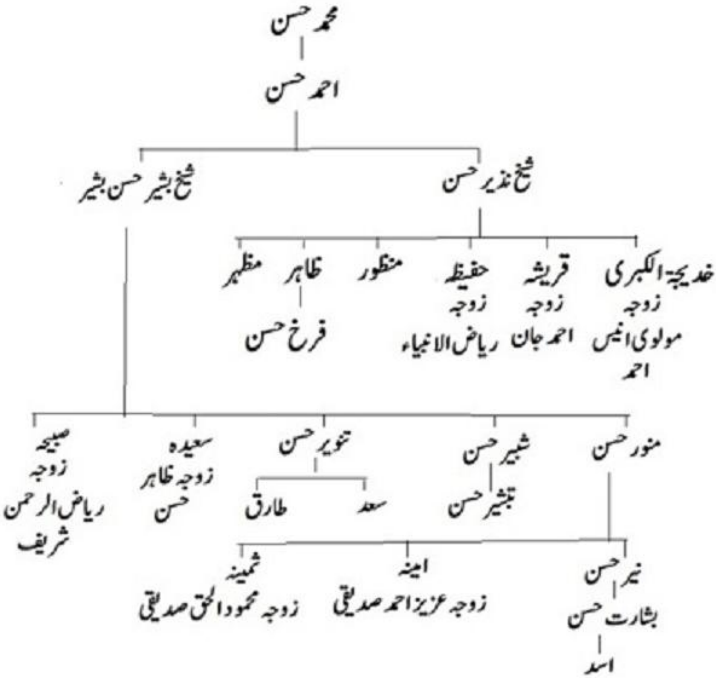
وہ شامل اشاعت کر دی ہیں -

بیشتر افراد آسودہ خاک ہو چکے ہیں

اللہ تعالی سب کے گناہ معاف اور بخشش فرمائے - آمین

منصور احمد صدیقی

شجرہ امینہ عزیز صدیقی



والدہ صاحبہ کی ننہیال کا مختصر تعارف

والدہ کی ننہیال میں جن کا ذکر ہے ان میں

والدہ سلطان جہاں بیگم تھیں جنکی والدہ کا نام خدیجہ الکبری تھا جو مولوی انیس احمد کی زوجہ تھیں تھیں۔

مولوی انیس احمد مشہور و معروف عالم دین تھے علیگڑھ سے بی اے، دہلی سے پوسٹ گریجویشن اور پھر دیوبند سے فارغ التحصیل ہوئے،

برٹش راج میں انہیں لوہے کے پنجرے میں رنگون نظر بند کر دیا گیا تھا۔ ان پر ایک کتاب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے تحریر کی ہے

سلطان جہاں بیگم اور انکی والدہ دونوں دونوں ماں اور بیٹی گلبرگ پشاور کے قبرستان میں دفن ہوئیں۔ مولوی انیس احمد لاہور میں دفن ہوئے اور

ان سب کو فوجی اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔

مولوی انیس احمد کے والد کا نام خان بہادر ادریس احمد تھا اور وہ محکمہ تعلیم میں اعلی افسر تھے۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔

سب سے بڑے بیٹے نفیس احمد جنکی زوجہ کا نام مظفر تھا، سلطان جہاں بیگم، شاہد احمد (جو ملٹری اکاؤنٹنٹ جنرل اور سی سی ایم اے رہے) تھے اور ایک بیٹی کا نام ہمایوں (زوجہ ایم ڈی اظہر) اور دوسری بیٹی کا نام فرزانہ (زوجہ رشید حسن) تھا۔

ددھیال میں:

شیخ بشیر حسن بشیر کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں ۔

منور حسن بشیر اور سعیدہ ،ان دونوں کی والدہ کا نام فاطمہ تھا جنکی ایک بہن حئ جو کہ والد ہ زاہد حسن گورنر سٹیٹ بینک تھیں اور جسٹس ناصر زاہد اور کئ مشہور افراد ان کی اولاد میں سے تھے)۔

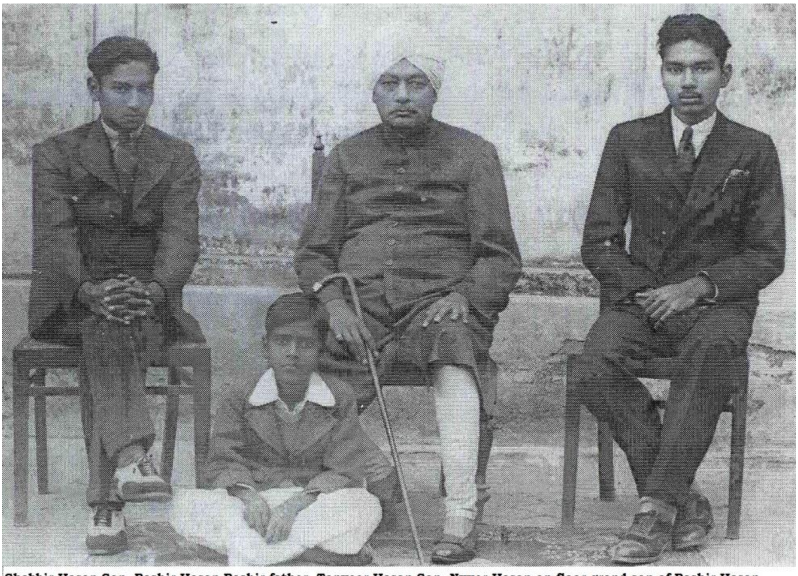
دوسری شادی خاقانی بنت زین العباء سے کی تھی جن کا ذکر ہواءجی اس کتاب میں ہے جن کے بطن سے شبیر حسن بشیر (ریلوے میں ڈویزنل سپرنٹنڈنٹ اور بڑے عہدوں پر رہے انکی شاد ی مشاہدہ بنت ابوالفرح سے ہوئ) اور کرنل تنویر

حسن بشیر (جن کی شادی ملکہ بنت خان بہادر ادریس احمد سے ہوئی)ہوئی۔

سب سے چھوٹی صبیحہ جنہیں جنیدہ کہا جاتا ہے کو چھوٹی پھوپھی تحریر کیا ہے انکی شادی ریاض الرحمن شریف سے ہوئی جو اریگیشن میں چیف انجینئر تھے انکے والد کا نام خان بہادر فضل الرحمن شریف تھا وہ بھی اریگیشن میں انجینئر تھے اور انکی زوجہ کا نام رومانی بنت زین العباء تھا۔

سعیدہ زوجہ ظاہر حسن کے بیٹے فرخ حسن تھے جو کسٹم کے محکمہ میں ڈائریکٹر تھے ان کے بیٹے ونگ کمانڈر مشہود، جنرل ضیاء کے طیارے کے پائیلٹ تھے اور انکے ساتھ شہید ہو کر اپنی دادی کے پہلو میں ماڈل ٹاؤن لاہور میں دفن ہوئے۔

ملکہ ژوجہ کرنل تنویر حسن بشیر اللہ کے فضل سے حیات ہیں اور کراچی رہائش ہے اللہ انہیں صحت اور لمبی زندگی عظاء فرمائے--آمین ۔



Shabbir Hasan Son, Bashir Hasan Bashir father, Tanveer Hasan Son, Nyyer Hasan on floor grand son of Bashir Hasan Bashir Prime Minister of Maler Kotla State

شیخ بشیر حسن بشیر درمیان میں جبکہ بیٹے دائیں طرف کرنل تنویر حسن بشیر

اور بائیں طرف شبیر حسن بشیر اور فرش پر پوتے نیر حسن بشیر



بیگم امینہ عزیز صدیقی



بیگم ثمینہ محمود صدیقی۔ چھوٹی بہن



بھائی نیر حسن بشیر کے ساتھ



بڑی پھوپھی سعیدہ بنت شیخ بشیر حسن بشیر



چھوٹی پھوپھی جنیدہ بنت شیخ بشیر حسن بشیر







Khadija tul Kubra wife of Moulvi Anis Ahmad and Quresha wife of Hasan Ahmad Jan
Both daughters of Nazir Hasan bin Ahmad Hasan bin Muhammad Hasan

29-03-1950
Rawalpindi

خدیجۃ الکبریٰ زوجہ مولوی انیس احمد اور قریشہ زوجہ حسن احمد جان

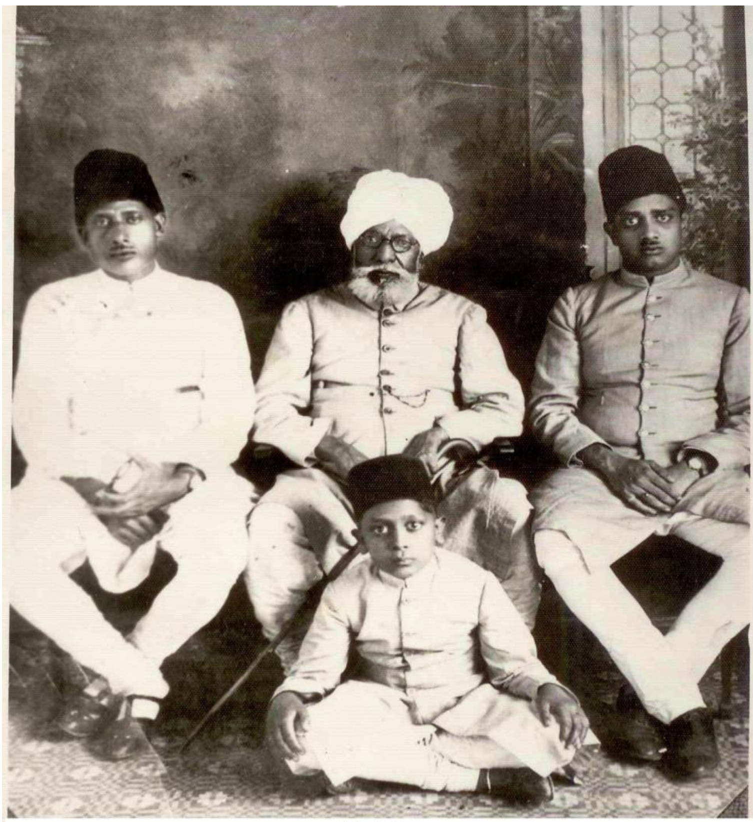


اوپر فرزانہ خالہ اور نیچے ہمایوں خالہ بنات مولوی انیس احمد





بیگم امینہ عزیز صدیقی اپنی بہن ثمینہ محمود صدیقی کے ہمراہ—راولپنڈی



Maler Kotla

مالیر کوٹلہ



بیگم امینہ ہمراہ شوہر عزیز احمد صدیقی—راولپنڈی



Maler Kotla

مالیر کوٹلہ



اوپر تصویر میں بیٹھے ہوئے دائیں طرف نفیس احمد اور بائیں شاہد احمد کھڑے

ہوئے۔کرنل تنویر حسن بشیر اور نیر حسن بشیر



کھڑے ہوئے فرخ حسن اور نیر حسن بشیر اور بیٹھے ہوئے

نفیس احمد ابن مولوی انیس احمد اور شاہد احمد ابن مولوی انیس احمد



دائیں سے بائیں کھڑے ہوئے شاہد احمد، نفیس احمد، فرخ حسن، عزیز احمد صدیقی، نامعلوم بیٹھے ہوئے ثمینہ، نسیمہ زوجہ شاہد احمد، مظفر زوجہ نفیس احمد، محمودہ زوجہ فرخ حسن، امینہ زوجہ عزیز احمد صدیقی



Mansoor in childhood with Shahid Ahmad

منصور احمد صدیقی جناب شاہد احمد کی گود میں 1953ءیا 1954 ء



Bismillah of Adil, 1956 or 1957. H.No 20 Gowalmandi Rawalpindi
Aziz 2nd from left standing, Mansoor 1st from left on floor

بسم اللہ عادل ابن نفیس احمد اپنے والد کی گود میں، کھڑے ہوؤں میں عمر احمد جان، شاہد احمد، نیر حسن، عزیز احمد صدیقی، رشید حسن، بچوں میں بائیں طرف سے منصور، جاوید، نویدہ، سکندر۔ دائیں بائیں صباحت اور وجاہت



With Grandsons Abubakar, Hamza at Rawalpindi

امینہ عزیز اپنے پوتوں کے ساتھ دائیں طرف ابو بکر اور بائیں طرف حمزہ



Mansoor with mother 1953

منصور احمد صدیقی اپنی والدہ امینہ عزیز کی گود میں

1953ءیا1954ء

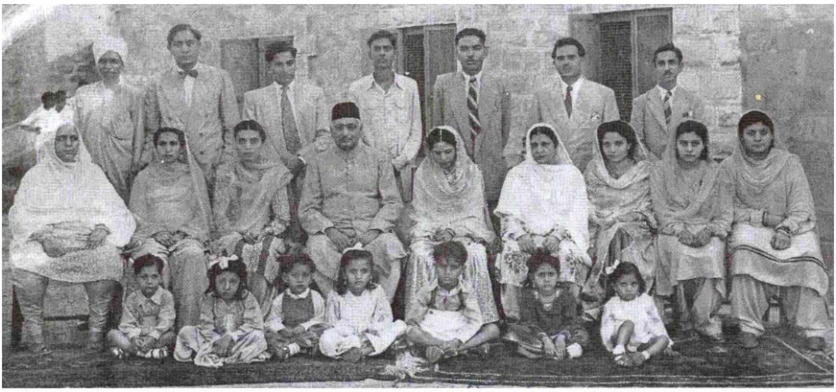
مالیر کوٹلہ کے گھر







دائیں طرف ملکہ اور بائیں طرف انکے شوہر کرنل تنویر حسن بشیر اپنے مالیر کوٹلہ کے گھر کے سامنے جب وہ وہاں پاکستان سے وزٹ پر تشریف لیگئے تھے درمیان میں غالبا موجودہ مالک مکان



L to R standing: Atoo servant, Farrukh Hasan, Shabbir Hasan, Nyyer Hasan, Tanvir Hasan, Aziz Siddiqui, Riaz ur Rahman Shariff 1952 Rawalpindi
On Chairs: Saeeda, Mahmooda, Mushahida, Bashir Hasan Bashir, Malka (Bride), Sultan Jahan, Junaida, Amina, Samina

یہ تصویر کرنل تنویر کی شادی کے موقعہ پر لی گئ تھی ، دائیں سے بائیں

ثمینہ ، امینہ ، جنیدہ، سلطان جہاں بیگم، ملکہ دلہن ، شیخ بشیر حسن ، مشاہدہ زوجہ شبیر حسن بشیر، محمودہ زوجہ فرخ حسن ، سعیدہ

کھڑے ہوئے—ریاض الرحمن شریف، عزیز احمد صدیقی، کرنل تنویر حسن بشیر، نیر حسن ، شبیر حسن بشیر، فرخ حسن اور ملازم عطو

25جون2009ء

اوصاف خواتین

بیگم امینہ عزیز صدیقی مرحوم کی قابل تحسین سماجی خدمات

ضرورت مند خواتین اور بچوں کی مدد کرنے کیلئے ہر وقت کمر بستہ رہتیں پاکیزگی کی اعلیٰ مثال تھیں

سعدیہ عباس

بیگم امینہ عزیز صدیقی کے انتقال کے بعد ان کی کمی اہلیان ویسٹرج اور راولپنڈی کے دیگر علاقوں میں رہنے والے افراد شدت سے محسوس کرتے رہیں گے۔خاص طور سے ان کی بے لوث نصف صدی پر محیط سماجی،سیاسی ،مذہبی اور تعلیمی خدمات کانعم البدل ممکن ہی نہیں۔

بیگم امینہ نے اپنے عمل اور اخلاقی کردار سے تمام ماؤں کے لئے حرمت اور آبرو کی زندہ مثال قائم کی۔وہ اپنے یقین وثبات کی ایسی تقلید مثال تھیں کہ جنہیں دیکھ کر ناامیدی و بے یقینی کے جال کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹ جائیں۔حتزلزل یقین کہ انہوں نے اپنا دامن ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے آگے ہی پھیلایا۔جس نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور لوگ پریشان ہوتے رہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔پاکیزگی اور ایمان کے اعلیٰ درجے پر فائز یہ نیک خاتون ہر اپنے وغیر کی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھیں۔پورے علاقے میں شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو کہ جن کے دکھ میں شریک نہ رہی ہوں۔ضرورتمند خواتین اور بچوں کا سارادن تانتا بندھارہتا اوران کی مدد پر ہر دم کمر بستہ رہتیں۔

ان کا ایمان تھا کہ ماں درسگاہ ہے جو پاکیزہ نسل کی تیاری میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔انہوں نے اسی جذبہ کے تحت یہاں 25 سال قبل صائمہ پبلک سکول کی بنیاد رکھی ۔یہ علاقے کیلئے کیمونٹی سینٹر کا کام بھی کرتا تھا اور غریب لوگوں کے سینکڑوں بچے اس سکول کی مدد سے زیور تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ان کے سینکڑوں شاگرد راولپنڈی اوراس کے گردونواح میں آباد ہیں۔اس سکول کی نہ تو چھت تھی نہ ہی اس میں فرنیچر تھا۔انتہائی نامساعد حالات اور موسم کی سختیوں کو جھیلتے ہوئے پابندی وجانفشانی سے بچوں کو تعلیم دینا ان کا ہی حوصلہ تھا۔سیاسی وزرا

ء اور سیاسی رہنماؤں نے دورے کئے،وعدے کئے لیکن کبھی کوئی وعدہ وفا نہ ہوا۔ان کے جنازہ میں خلقت کا اتنا اژدھام تھا کہ نماز جنازہ ریلوے سٹیڈیم میں ادا کی گئی۔بیگم امینہ عزیز صدیقی کے خاندان نے تاریخی ریاست مالیر کوٹلہ سے ہجرت کی تھی ۔جہاں ان کے دادا بشیر حسن بشیر وزیر اعظم تھے۔وہاں محلہ شیخاں اب بھی معروف ہے جہاں ان کے رہائشی مکانات اور جائیدادیں تھیں۔دوران تقسیم جب مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی تو ریاست مالیر کوٹلہ ہی محفوظ مقام تھا جہاں ان کے خاندان نے درجنوں گھرانوں کو پناہ دی۔آپ کے والد وہاں پولیس آفیسر تھے اور جب ان کا انتقال ہوا تو آپ کی عمر تین برس تھی ۔آپ کے نانا مولوی انیس احمد مشہور سیاسی شخصیت ، پرنسپل حیدر آباد کالج ،اور جنہوں نے قرآن پاک کا اردو ترجمہ انوار القرآن کے نام سے کیا تھا ۔آپ کا سارا خاندان بے سروسامانی کے عالم میں فوجی ٹرکوں پر راولپنڈی پہنچا جس کا بندوست آپ کے چچا کرنل تنویر بشیر نے کیا تھا۔آپ کی شادی عزیز احمد صدیقی سے ہوئی جن کا تعلق لاہور کے قدیم مذہبی اور علمی خانوادے سے تھا۔جن میں مولوی نور احمد چشتی مصنف تحقیقات چشتی ،ملک الصحاف حافظ محمد بخش صحاف جنہوں نے مکتبہ صحافی لاہور کی بنیاد رکھی تھی، مفتی علی الدین مصنف عبرت نامہ اور علامہ علاء الدین صدیقی وغیرہ شامل ہیں۔

آپ کی پیدائش 12جنوری1934ء کو مالیر کوٹلہ میں ہوئی۔راولپنڈی میں اپنے خاوند کے ہمراہ ریلوے کے مکان میں رہائش اختیار کی جہاں آپ نے زندگی کے بقایا نصف صدی سے زائد ایام بسر کئے اور اسی ہی گھر میں جاں بحق ہوئیں۔اکثر مشہور سیاسی و مذہبی شخصیات ان سے مشورہ طلب

کرتیں۔بیگم نصرت بھٹو اور بیگم خاکوانی نے انہیں تحقیقاتی کمیٹی کا سربراہ نامزد کیا تھا۔1977ء میں جب پیپلز پارٹی مشکلات سے دوچار تھی اس وقت بھی ان سے مدد کی درخواست کی گئی جس میں ڈاکٹر



غلام حسین سیکریٹری جنرل بھی شامل تھے۔پیپلز پارٹی نے انہیں جلد بھلا دیا اور ایک بھی وزیر کو ان کی وفات پر دولفظ کہنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ماضی قریب میں نہ صرف اعجاز الحق بلکہ ان کی وفات سے چند دن قبل شیخ رشید جو وزیر ریلوے بھی تھے قومی انتخابات میں حمایت حاصل کرنے ان کے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔انہیں بھی تعزیت کے دولفظ کہنے کا وقت نہ مل سکا۔پروفیسر ابوبکر غزنوی اور پروفیسر عبدالحفیظ سربراہان شعبہ علوم اسلامی انجینئرنگ یونیورسٹی ،بیگم عزراء ریاض رکن اسلامی نظریاتی کونسل اور کئی دیگر افراد نے ان کی خدمات کی تعریف اور حوصلہ افزائی کی ۔آپ نے اپنی سوانح حیات،تقسیم کے واقعات اور اردو وانگریزی میں کئی مضمون تحریر کئے جو غیر مطبوعہ ہیں۔چند نظمیں جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔آپ

کے چار بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہوئیں جو سب راولپنڈی میں رہائش رکھتے ہیں۔بڑے بیٹے منصور احمد صدیقی صحافی ،محقق اور تین کتابوں کے مصنف ہیں۔انکی تصنیف انساب صدیقی بہت مقبول عام ہے۔دیگر بیٹوں میں محمود احمد صدیقی ،شادمان صدیقی اور افضل صدیقی شامل ہیں ۔تمیز صدیقی ،ونگ کمانڈر افتخار محمود،طارق محمود اور رضوان صادق انصاری ان کے داماد ہیں۔آپ کے بھائی نیر بشیر تھے جو وفاقی ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز اور بے نظیر دور میں انکے مشیر بھی رہے۔بیگم آمینہ صدیقی کی ان گنت عوامی خدمات ایک عرصے تک یاد رکھی جائیں گی

۔جہاں انہوں نے غریبوں کے حقوق کیلئے دن رات ایک کیا وہاں بچوں کی تعلیم خاص طور سے تعلیم نسواں کی بہت بڑی علمبردار تھیں۔آپ ان سب لوگوں کیلئے مشعل راہ ہیں جو کسی بھی فلاحی کام کو شروع کرنے سے پہلے اقتصادی پہلوؤں پر اپنی توانائیاں صرف کردیتے ہیں۔آپ پر عزم ،باحوصلہ ،دردمند اور نڈر خاتون تھیں۔انتہائی نامساعد حالات میں اپنے بچوں کی پرورش کی جبکہ آپ کے شوہر کا انتقال 25 برس قبل ہی ہو گیا تھا۔اور کبھی بھی رضاکارانہ عوامی وفلاحی کاموں سے منہ نہ موڑا۔آپ کی وصیت کے مطابق ڈھوک حسو قبرستان میں اپنے شوہر عزیز احمد صدیقی کے پہلو میں دفن ہوئیں۔

INTERNATIONAL THE NEWS

Residents of Dhoke Hassu still remember Begum Amina

Tuesday, April 28, 2009

Rawalpindi

Ever since Begum Amina Aziz Siddiqui died a chapter of history is closed, her involvement in community affairs and to work for welfare of the poor of Dhoke Hassu is spread over more than half a century.

She established Saima Public School here about 25 years ago. It was school-cum-community centre, which helped poor people to send their children to school.

According to a press release, now hundreds of her students are living in Rawalpindi and other areas. It was an open school without any roof and furniture; she used to teach in harsh weather continuously without any help from any quarter. Many politicians, even ministers, who visited the school promised to help, but it never happened.

Family of Begum Amina Aziz Siddiqui migrated from historical Malair Kotla state, India, where her grandfather Bashir Hasan Bashir was prime minister. Mohallah Sheikhan in Malair Kotla is still famous due to their family houses and property. During partition when Muslims were thrown out of their homes in India, Malair Kotla, was the only safe haven for them; their family provides shelter to dozens of Muslim families. Her maternal grandfather Moulvi Anees Ahmed, the Principal of Hyderabad College, was prominent political figure and also famous for translation of the Holy Qur'aan in Urdu 'Anwar ul Quran'. Whole family arrived Pakistan empty handed when her uncle Colonel Tanvir Bashir helped them to move in an army trucks from Malair Kotla.

Begum Amina was married to Aziz Ahmed Siddiqui, who belonged to prominent literary and religious Siddiqui family of Lahore.

Born at Malair Kotla state on Jan 12, 1934 her father was police official of the state who died when she was of three years old. In Rawalpindi after the partition both husband and wife decided to live in a Railway accommodation, passed rest of life in that house over half century and died in the same house.

Prominent politicians and religious personalities used to call her for discussions. Begum Nusrat Bhutto and Begum Khakwani appointed her head of 'Investigation Committee', in 1977 when PPP was in trouble. She also requested Begum Amina to help the party including Ghulam Hussain, secretary general of PPP. But the PPP forgot her soon and not a single PPP minister bothered to issue a statement on her death.

Professor Abubakar Ghaznavi, Head of Islamic Studies Engineering University Lahore, Begum Azra Riaz, member Islamic Ideological Council, and many others appreciated and supported her in her mission.

She wrote her biography and many essays in English and Urdu on historical events of the partition, but they yet to be published. She left behind four sons and five daughters. Eldest son Mansoor Siddiqui is a journalist, author of three books and researcher, others Mahmood Siddiqui, Shadman Masood Siddiqui and Afzal Siddiqui all reside in Rawalpindi. Wing Commander Iftikhar Mahmood and Tameez Siddiqui are her sons-in-law.

Her countless services for community will be remembered for long time. She is a beacon of light for those who first think about economical help before starting any welfare work. She had remarkable determination, passion and courage, as she raised all children and never turned face from voluntary community services despite the fact that her husband died 25 years ago.

http://www.thenews.com.pk/print1.asp?id=174740

Obituary THE NEWS

Residents of Dhoke Hassu still remember Begum Amina



Rawalpindi

Ever since Begum Amina Aziz Siddiqui died a chapter of history is closed, her involvement in community affairs and to work for welfare of the poor of Dhoke Hassu is spread over more than half a century.

She established Saima Public School here about 25 years ago. It was school-cum-community centre, which helped poor people to send their children to school.

According to a press release, now hundreds of her students are living in Rawalpindi and other areas. It was an open school without any roof and furniture; she used to teach in harsh weather continuously without any help from any quarter. Many politicians, even ministers, who visited the school promised to help, but it never happened.

Family of Begum Amina Aziz Siddiqui migrated from historical Malair Kotla state, India, where her grandfather Bashir Hasan Bashir was prime minister. Mohallah Sheikhan in Malair Kotla is still famous due to their family houses and property. During partition when Muslims were thrown out of their homes in India, Malair Kotla, was the only safe haven for them; their family provides shelter to dozens of Muslim families. Her maternal grandfather Moulvi Anees Ahmed, the Principal of Hyderabad College, was prominent political figure and also famous for translation of the Holy Qur'aan in Urdu 'Anwar ul Quran'. Whole family arrived Pakistan empty handed when her uncle Colonel Tanvir Bashir helped them to move in an army trucks from Malair Kotla.

Begum Amina was married to Aziz Ahmed Siddiqui, who belonged to prominent literary and religious Siddiqui family of Lahore.

Born at Malair Kotla state on Jan 12, 1934 her father was police official of the state who died when she was of three years old. In Rawalpindi after the partition both husband and wife decided to live in a Railway accommodation, passed rest of life in that house over half century and died in the same house.

Prominent politicians and religious personalities used to call her for discussions. Begum Nusrat Bhutto and Begum Khakwani appointed her head of 'Investigation Committee', in 1977 when PPP was in trouble. She also requested Begum Amina to help the party including Ghulam Hussain, secretary general of PPP. But the PPP forgot her soon and not a single PPP minister bothered to issue a statement on her death.

Professor Abubakar Ghaznavi, Head of Islamic Studies Engineering University Lahore, Begum Azra Riaz, member Islamic Ideological Council, and many others appreciated and supported her in her mission.

She wrote her biography and many essays in English and Urdu on historical events of the partition, but they yet to be published. She left behind four sons and five daughters. Eldest son Mansoor Siddiqui is a journalist, author of three books and researcher, others Mahmood Siddiqui, Shadman Masood Siddiqui and Afzal Siddiqui all reside in Rawalpindi. Wing Commander Iftikhar Mahmood and Tameez Siddiqui are her sons-in-law.

Her countless services for community will be remembered for long time. She is a beacon of light for those who first think about economical help before starting any welfare work. She had remarkable determination, passion and courage, as she raised all children and never turned face from voluntary community services despite the fact that her husband died 25 years ago.

Pakistan Link

Saturday, October 25th, 2008

Mansoor Siddiqui's Mother Passes away

n Amina Aziz Siddiqui, Principal and founder of Saima Public School Rawalpindi, has passed away. She was the
r of renowned journalist, writer and researcher Mansoor Siddiqui, aunt of Farhana Siddiqui, and grandmother of
o, Waqas and Abubakr Siddiqui.
as a well-known political, social and religious personality of Rawalpindi and her services to the community will be
nbered for a long, long time.
e number of community members attended the Qur'an khwani and fatheha held at the Jamia Islamia Canada,
sauga, on Saturday, May 17, 2008.
er soul rest in peace and God grant the bereaved family the courage and fortitude to bear the loss. (Ameen)


اینڈ ساؤنڈ سروس



Addressing a public meeting under chairmanship of Dr. Ghulam Husain Gen Secretary PPP, Rawalpindi 1977

اس تصویر میں والدہ جلسہ سے خطاب کر رہی ہیں اور بائیں طرف غلام حسین

مرکزی سیکریٹری جنرل پیپلز پارٹی ہیں 1977ء

اور

اس سے پہلے کی تصویر میں بھی ایک جلسہ سے خطاب کر رہی ہیں جبکہ

وہ جنزل سیکریٹری ڈھوک منگال تھیں



AKHBAAR-E-PAKISTAN CANADA

اخبارِ پاکستان

WWW.AKHBAAREPAKISTAN.COM

VOL. 4 • ISSUE 213 • MAY 23 TO MAY 29, 2008 3264 ANGEL PASS DRIVE, MISSISSAUGA, ON L5M7K1 TEL: 416.835.1997 • FAX: 905.607.8080 • EMAIL: AKHBAAR@GMAIL.COM

منصور صدیقی کی والدہ کا انتقال

مسی ساگا (اخبار پاکستان) معروف رائٹر اور محقق منصور صدیقی کی والدہ بیگم آمنہ عزیز صدیقی راولپنڈی میں انتقال کر گئیں۔ مرحومہ سابقہ پبلک سکول راولپنڈی کی بانی پرنسپل تھیں۔ مرحومہ فرحانہ صدیقی کی آنٹی اور وہاب صدیقی، وقاص صدیقی اور ابوبکر صدیقی کی گرینڈ مدر تھیں۔ مرحومہ راولپنڈی کی سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیت تھیں اور ان کی خدمات کو یاد رکھا جائے گا۔ جامعہ اسلامیہ مسی ساگا میں مرحومہ کی روح کے ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی ہوگی۔

وفات پر قومی اخبارات کے علاوہ امریکہ، کینیڈا کے اخبارات میں

تعزیتی خبریں

DAILY NAWA-I-WAQT
RAWALPINDI
ISLAMABAD

روزنامہ
نوائے وقت
بانی حمید نظامی مرحوم
ایڈیٹر مجید نظامی
راولپنڈی
اسلام آباد

راولپنڈی/اسلام آباد، لاہور، کراچی، اور ملتان سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

شمارہ	رجسٹرڈ نمبر	صفحات		جلد
308	این پی آر 003	16	جمعۃ المبارک، 10 جمادی الاول 1429ھ، 16 مئی 2008ء، 3 جیٹھ 2065ب فون۔ راولپنڈی: 77-5562676، اسلام آباد 44-2202641 UAN 111-222-007 قیمت 9 روپے	54

انتقال پر ملال

اسلام آباد (پ ر) منصور احمد صدیقی سینئر انجینئر نیشنل کنسٹرکشن لمیٹڈ اسلام آباد اور محمود احمد صدیقی کیرج فیکٹری کی والدہ محترمہ بیگم عزیز احمد صدیقی گزشتہ روز انتقال کر گئیں ان کی رسم قل بروز ہفتہ 17 مئی 2008 کو

Pak-American's Weekly
Pakistan News
ہفت روزہ
پاکستان نیوز
ٹورنٹو
نارتھ امریکہ میں پاکستانی کیمونٹی کا صف اول کا مقبول ترین اردو اخبار

ارشادِ خداوندی

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانستہ نقصان پہنچا بیٹھو

(الحجرات:٦)

پبلشر: مجیب ایس لودھی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: میاں محمد مدثر
Email: PakistanNews2@aol.com
New York, New Jersey, Washington, Chicago, Houston, Atlanta, California, Los Angeles, Detroit, London, Karachi and Canada
Tel:905-279-1307, 416-319-2976
Fax: 647-439-1484 - email: WeeklyPakistan@aol.com
Address: 185 Richvale Drive South, Brampton, ON L6Z 4P6

Vol 13, Issue # 21 - May 22 to May 28, 2008 - Jamadiul-Awal 14 to Jamadiul-Awal 20, 1429

www.newspakistan.org

منصور صدیقی کی والدہ بیگم امینہ صدیقی انتقال کر گئیں

مرحومہ صائمہ پبلک سکول راولپنڈی کی بانی پرنسپل اور معروف سیاسی، سماجی اور مذہبی شخصیت تھیں

ایصال ثواب کیلئے جامعہ اسلامیہ کینیڈا میں قرآن خوانی ہوئی جس میں پاکستانی کمیونٹی کی کثیر تعداد نے شرکت کی

ٹورنٹو (پاکستان نیوز) معروف صحافی، مصنف و محقق منصور صدیقی کی والدہ بیگم امینہ صدیقی راولپنڈی میں انتقال کر گئیں۔ وہ صائمہ پبلک سکول راولپنڈی کی بانی اور پرنسپل تھیں وہ فرحانہ صدیقی کی خالہ، ملیکہ وہاب ابوبکر اور وقاص صدیقی کی دادی تھیں۔ وہ راولپنڈی کی معروف سیاسی سماجی و مذہبی شخصیت تھیں اور ان کی خدمات طویل عرصے تک یاد رکھی جائیں گی۔ ان کے ایصال ثواب کیلئے قرآن خوانی جامعہ اسلامیہ کینیڈا مسی ساگا میں ہوئی جس میں پاکستانی کمیونٹی کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

بے شک بے خبری جہالت ہے

ہفت روزہ

اردو پوسٹ

کینیڈا

WEEKLY Urdu Post CANADA

www.urdupost.info

16 Jamadi-ul-Awwal 1429 H. Thursday, May 22th, 2008

Ph: 416-494-6397 Fax: 416-628-1610 ..... Vol: 1 Issue 19,

..... e-mail: info@urdupost.info

ہفت روزہ 'اردو پوسٹ' (3) 22 مئی 2008ء

منصور صدیقی کی والدہ ماجدہ بیگم آمنہ عزیز صدیقی انتقال کر گئیں

مرحومہ صائمہ پبلک اسکول روالپنڈی کی بانی پرنسپل تھیں، منصور صدیقی کی والدہ ماجدہ بیگم آمنہ عزیز صدیقی گزشتہ دنوں راولپنڈی میں انتقال کر گئیں

انھیں شہر میں خصوصی مقام حاصل تھا مرحومہ کو ایصال ثواب کے لئے جامع اسلامیہ میں قرآن خوانی کی گئیں

ٹورنٹو (خبر نگار) پاکستان کمیونٹی کے جانے پہچانے معروف مصنف فری لانس جرنلسٹ منصور صدیقی کی والدہ ماجدہ بیگم آمنہ عزیز صدیقی گزشتہ دنوں راولپنڈی میں انتقال کر گئیں مرحومہ صائمہ پبلک اسکول روالپنڈی کی بانی پرنسپل تھیں معروف محقق، رائٹر منصور صدیقی کی والدہ تھیں فرحان صدیقی کی خالہ تھیں وہاب صدیقی، وقاص صدیقی، ابوبکر صدیقی کی دادی تھیں مرحومہ راولپنڈی میں سیاسی مذہبی سماجی لیڈر تھیں اور انھیں شہر میں خصوصی مقام حاصل تھا مرحومہ کو ایصال ثواب کے لئے جامع اسلامیہ میں قرآن خوانی کی گئی جس میں بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی منصور صدیقی سے 905-848-7018 پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔



شیخ رشید احمد موجودہ وزیر داخلہ گھر میں جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے



امینہ عزیز نے اس گھر میں اپنی زندگی کے پچاس سے زیادہ برس گزارے



امینہ عزیز نے اس گھر میں اپنی زندگی کے پچاس سے زیادہ برس گزارے



آخری آرام گاہ–ڈھوک حسو قبرستان–راولپنڈی



آخری آرام گاہ—پس منظر میں عزیز احمد صدیقی کی قبر